قرآن اور جستجوئے مطالعہ

(سوالات و جوابات)

جوابات از

علمائے قم و نجف

مرتبہ

مجاہد حسین حرؔ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔

نام کتاب .... قرآن اور جستجوئے مطالعہ (سوالات و جوابات)

جوابات از .... علمائے قم و نجف

مرتبہ .... مجاہد حسین حرؔ

پروف ریڈنگ .... خانم شازیہ غضنفر

کمپوزنگ .... قائم گرافکس۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس فیز ۴

ناشر .... مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ ....

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

03214971214،04237361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

03335234311

انتساب

قرآن کریم

سے

انس و محبت

رکھنے والوں

کے نام

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم و تفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی انشاء اللہ العزیز شائع کی جاتی رہے گی۔

موجودہ کتاب "قرآن اور جستجوئے مطالعہ" قرآنی معرفت کا ایک سلسلہ ہے۔ قرآن مجید سے شغف رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک مفید تحفہ ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطلع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ ادارہ کے ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست کتاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے پہلے اعوذ با للہ من الشیطان الرجیم کیوں پڑھا جاتا ہے؟ 7
عقل، قرآن، سنت، شہود کس طرح اخلاق کے لئے منبع شمار کئے جاسکتے ہیں؟ 9
اخلاق میں عقل و نقل کا مقام 10
عقل 14
عقل اور اخلاقی احکام کا بامعنی ہونا 14
عقل کا تمام احکام کی تحصیل کا ماخذ ہونا 14
قرآن 15
سنت 16
شہود 17
دوسرے ادیان کے پیروں کے ساتھ مسلمانوں کے صلح آمیز سلوک کے بارے میں قرآن مجید کا نظریہ کیا ہے؟ 22
سنگسار کے حکم کا تاریخی سابقہ کیا ہے؟ کیا اس زمانہ میں اس حکم کا نفاذ اسلام کے نقصان میں نہیں ہے؟ 24

قرآن مجید کے کتنے سورے حیوانوں کے نام پر ہیں؟ 32
کیا کتاب شریف کافی کی احادیث قرآن مجید کی آیات کی تفسیر ہوسکتی ہیں؟ 34
کیا روح موت کے بعد دنیا کے امور اور حوادث سے آگاہی حاصل کرسکتی ہے؟ 38
فرشتوں کی عمر کتنی ہے؟ کیا مقرب فرشتے بھی مر جائیں گے؟ کس طرح؟ 41
خدا بعض بندوں کو بھول جاتا ہے۔ اس جملے کا کیا مطلب ہے؟ 44
خدا کی نعمتوں کا شکر بجالانا کیوں واجب ہے؟ 50
قرآن مجید میں تحریف نہ ہونے کی کیا دلیل ہے؟ 55
کیا اسلام کی نظر میں تعظیم کا سجدہ جائز ہے؟ 65
شیطان اور نفس امارہ کے درمیان کیا فرق ہے؟ 74
خیر وشر کے پیش نظر، دنیا میں برائی اور بھلائی کو کیسے خدا کی مہربانی ثابت کیا جاسکتا ہے؟ 81
ائمہ معصومین علیہم السلام کے نام کیوں واضح طور پر قرآن مجید میں ذکر نہیں ہوئے ہیں؟ 88
برہان نظم کیا ہے؟ 98
کن حالات میں دعا قطعی طور پر قبول ہوتی ہے؟ 113
دین کیوں مکمل صورت میں اور دفعتاً نہیں بھیجا گیا اور اس کے تدریجی صورت میں ارسال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟! 124

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے پہلے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کیوں پڑھا جاتا ہے؟

مختصر جواب

قرآن مجید کی آیات اور روایات کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت کے آداب میں سے ایک، قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کا پڑھنا ہے، حتی اسے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سے پہلے پڑھنا چاہئے، اس وجہ سے کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ قرآن مجید کا جزو ہے البتہ یہ پناہ لینا صرف لفظ اور کہنے تک محدود نہیں ہونا چاہئے بلکہ یہ دل و جان کی گہرائیوں تک اثر کرنا چاہئے اور تلاوت کی پوری مدت کے دوران یہ حالت برقرار رہنی چاہئے

تفصیلی جواب

اسلام میں ہر چیز کے لئے، خاص کر قرآن مجید جیسی عظیم کتاب سے استفادہ کرنے کے لئے خود قرآن مجید میں اس کی تلاوت اور اس کی آیات سے استفادہ کرنے کے لئے کچھ آداب و شرائط بیان کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

1 قرآن مجید کے خطوط کو باطہارت اور با وضو چھونا چاہئے قرآن مجید اس سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے اس کو پاک و پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی چھو بھی نہیں سکتا ہے [1]

یہ تعبیر، ممکن ہے کہ ظاہری پاکیزگی کی طرف اشارہ ہو، اور ممکن ہے اس مطلب کی طرف بھی اشارہ ہو کہ ان آیات کے مطالب اور محتویٰ کو سمجھنا صرف ان لوگوں کے لئے ممکن ہے کہ جو اخلاقی برائیوں سے پاک ومنزہ ہوں یعنی، انسان کو ان برے صفات سے پاک ہونا چاہئے جو اس کی حقیقت بین آنکھوں پر پردہ ڈالتی ہیں تاکہ جمال حق اور قرآن مجید کے حقائق کا مشاہدہ کرنے سے محروم نہ ہو جائے

2 قرآن مجید کی ترتیل کی صورت میں تلاوت کی جانی چاہئے، یعنی رک، رک کر اور غور وفکر کے ساتھ [2]

3 قرآن مجید کی تلاوت کو شروع کرتے وقت **شیطان رجیم** سے خداوند متعال کی پناہ مانگنی چاہئے، چنانچہ ہم نے مذکورہ آیات میں پڑھا ہے کہ: لہٰذا جب آپ قرآن پڑھیں تو **شیطان رجیم** کے مقابلہ کے لئے اللہ سے پناہ طلب کریں [3]

ایک روایت میں ملتا ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے اس سوال کے جواب میں کہ ہم کیسے اس حکم پر عمل کریں گے؟ اور کیسے کہیں؟ فرمایا کہ یوں کہو: **استعیذ بالسمیع العلیم من الشیطان الرجیم**

ایک دوسری روایت میں پڑھتے ہیں کہ امامؑ نے سورہ حمد کی تلاوت کے دوران فرمایا: **اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم و اعوذ باللہ ان یحضرون** یعنی: میں **شیطان رجیم** سے خداوند شنوا و دانا کی پناہ طلب کرتا ہوں اور میرے پاس حاضر ہو جانے سے اس کی پناہ چاہتا ہوں

لیکن یہ کہ قرآن مجید کی تلاوت کے دوران، **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** کو **بسم اللہ الرحمن الرحیم** سے پہلے پڑھنا اس وجہ سے ہے کہ **بسم اللہ الرحمن الرحیم**، قرآن مجید کا جزو ہے، اس لئے متن قرآن میں داخل ہونے سے

پہلے اعوذباللہ کو پڑھنا چاہیے

اس کے علاوہ ایک روایت میں آیا ہے کہ جبریل امینؑ نے جو پہلی چیز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن مجید کے بارے میں بتائی وہ یہ تھی: اے محمد! کہہ دو: استعیذ بالسمیع العلیم من الشیطان الرجیم اس کے بعد کہدو: بسم اللہ الرحمن الرحیم * اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ ۚ‏﴿۱﴾ [4]

البتہ یہ پناہ چاہنا صرف لفظ و بات تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ انسان کی روح و جان کی گہرائیوں میں اثر کرنا چاہیے، اس طرح کہ انسان قرآن مجید کی تلاوت کرتے وقت شیطانی صفتون سے دور رہے اور الٰہی صفتوں کے نزدیک ہو جائے تا کہ کلام حق کو سمجھنے کی راہ میں موجود موانع اس کی فکر سے دور ہو جائیں اور حقیقت کے دل ربا جمال کو صحیح طور پر دیکھ سکے [5]

اس بنا پر قرآن مجید کی تلاوت کے آغاز پر شیطان سے خدا کی طرف پناہ چاہنا ضروری ہے اور پوری تلاوت کے دوران یہ حالت جاری رہنی چاہیے، اگر چہ زبان پر نہ ہو

حواشی

[1] واقعہ 79، لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَؕ‏ ﴿۷۹﴾

[2] مزمل، 4، وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا ؕ‏ ﴿۴﴾

[3] نحل 98، فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ ﴿۹۸﴾

[4] مستدرک الوسائل ج 4، ص 4265 الشیخ ابو الفتوح الرازی فی تفسیرہ، عن عبداللہ ابن عباس قال انہ نزلت او اول ما قالہ جبریل لرسول اللہ ص فی امر القرآن ان قال لہ یا محمد قل استعیذ یالسمیع العلیم من الشیطان الرجیم ثم قال بسم اللہ الرحمن الرحیم اقرا باسم ربك الذی خلق

[5] تفسیر نمونہ، ج 11، ص: 401 و 402

عقل، قرآن، سنت، شہود کس طرح اخلاق کے لئے منبع شمار کئے جاسکتے ہیں؟

مختصر جواب

اخلاقی ذمہ داریاں کہاں سے پیدا ہوئی ہیں؟ اس سلسلہ میں مختلف نظریات اور مبانی سامنے آئے ہیں اور ہمارے اخلاقی نظام کی بنیاد پر مندرجہ بالا تمام منابع اخلاق کی ایک خاص سمت کو استحکام بخشتے ہیں اور اس باغ کے ایک گوشہ کو آباد کرتے ہیں۔ عقل ہمارے لئے اخلاق کے اساسی پایوں اور لزوم و عدم لزوم کو بیان کرتی ہے (مثلا کہتی ہے کہ اخلاق کو ہونا چاہیے ورنہ امن و امان کے ساتھ اور بہتر طریقہ سے زندگی نہیں گذاری جاسکتی) یا مستقلات عقلیہ میں اخلاقی لزوم یا عدم لزوم اور اخلاق کے اصول کلی کو بیان کرتی ہے قرآن ہمارے لئے اخلاق کی پوشیدہ باریکیوں کو بیان کرتا ہے؛ اہل بیتؑ عمل (سنت) کی شکل میں ہمارے سامنے اصول اخلاق کو پیش کرتے ہیں۔ عقل و وحی جن کا حکم لگا چکی ہیں ان کے حدود اور قلمروؤں کو اپنے عمل اور بیان کے ذریعہ کھولتے ہیں اور ہمیں اس قابل بناتے ہیں کہ ہم جان و دل اور اپنی آنکھوں سے اپنے اعمال کی حقیقت کو درک کرسکیں اور محسوس کرسکیں۔

تفصیلی جواب

اس سلسلہ میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں کہ اخلاقی احکام کا منبع کیا ہے؟ آیا اس میں اخلاقی مسائل کا دخل ہے؟ یا عقل؟ یا معاشرہ؟ یا پھر اور کوئی سبب؟

ظاہر ہے کہ ہم اپنے اخلاقی نظام میں کسی چیز کو بھی بنیاد بنائیں اور کسی بھی مبنا کو

اختیار کریں بالآخر اخلاقی دستورات اور احکام کے حصول کے لئے ہمیں نظام اخلاقی سے ہٹکر کسی منبع کو ماننا پڑے گا۔ دوسرے لفظوں میں کہ: نظام اخلاقی اور منابع اخلاقی میں ایک منطقی اور عقلائی رابطہ پایا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی اخلاقی نظام میں سے کوئی حکم یوں ہی نکال دیا جائے یا یونہی داخل کردیا جائے۔[1]

مذکورہ منابع کے کردار کو صحیح طور سے واضح کرنے کے لئے ہم پہلے عقل و نقل (قرآن وسنت) کو کلی طور سے اور اس کے بعد مذکورہ منابع یعنی عقل، قرآن، سنت و شہود پر الگ الگ بحث کریں گے:

اخلاق میں عقل و نقل کا مقام

اسلامی تاریخ میں عقل و نقل (قرآن وسنت) کے مقام کے سلسلہ میں تین زاویہ نظر دکھائی دیتے ہیں: نقل محوری، عقل مداری اور درمیانہ راستہ۔

ا۔ پہلے زاویہ نظر کے مطابق ہر طرح کی اچھائی اور برائی کے سلسلہ میں فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا اچھائی وہی ہے جس کا شارع حکم کردے اور برائی وہ ہے جس سے شارع روک دے۔ کیونکہ یہ کام (اچھائی اور برائی کا فیصلہ کرنا) ان کی عقل سے باہر ہے۔[2]

اہل سنت میں سے اہل حدیث، حشویہ، حنابلہ، اور اہل تشیع میں سے اخباریین اس زاویہ نظر کے حامل ہیں، اس نظریہ کی بنیاد پر عقل صرف دین کی خدمت گذار کی حیثیت رکھتی ہے اور دین کے مفاہیم و مقاصد کو سمجھنے کا ایک ذریعہ ہے۔[3]

۲۔ دوسرے زاویہ نگاہ کے اعتبار سے شرع سے بے نیاز ہوکر عقل اچھائی اور برائی کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس نظریہ کو [افراطی عقل محوری] بھی کہا جاتا ہے اور یہ ہمیشہ

مذکورہ بالا عقل ستیز نظریہ کے مقابلہ میں رہا ہے اور بد قسمتی سے (حاکمان وقت کی حمایت کے سبب) اس کے مقابل میں ناکامی کی وجہ سے اسلامی افکار کے سلسلہ میں ایک غلط نتیجہ دے دیا گیا ہے۔[4]

۳۔ اچھائی اور برائی کی شناخت اور اخلاقی میدان میں مذکورہ دو ناقص نظریوں کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا درمیانہ نظریہ بھی پایا جاتا ہے جو تشیع کا عمیق عقلی نظریہ ہے اور اسلامی معتدل عقل پسندی سے عبارت ہے۔ اس نظریہ کے بیان کے لئے مختصر طور پر ہی صحیح لیکن کچھ نکات کا ذکر ناگزیر ہے:

(الف) انسان کی شناخت کی راہیں (عام انسان کے پیش نظر اور وحی و شہود سے قطع نگاہ) حس اور عقل میں منحصر ہیں۔

(ب) حسی ادراک درحقیقت ظاہری حواس کے ذریعہ اور مادی دنیا سے رابطہ کے نتیجہ میں وجود پاتا ہے۔ اس ادراک کا قلمرو کافی محدود ہوتا ہے لہٰذا اس سے یہ امید نہیں لگائی جاسکتی کہ اس کے ذریعہ ہم زندگی کے تمام راستوں کو پہچان سکیں۔[5] اس کے علاوہ خود حس بھی بہت جگہوں پر غلطی کرتی ہے اور جانچ پرکھ سے عاجز ہے۔

(ج) ادراک عقلی بھی مفاہیم کلی اور بدیہیات اولیہ کے درک کا واحد راستہ ہے۔ یہ بھی زندگی کے راستوں کی تعیین اور شناخت میں کوئی فائدہ نہیں دیتے۔ ایسی شناختوں کا زیادہ سے زیادہ یہ فائدہ ہے کہ کچھ محض فلسفی قسم کے مثلاً خدا کے وجود کو ثابت کرسکتے ہیں۔[6]

(د) ایک طرف تو شناخت کے سلسلہ میں مذکورہ تمام تر ناتوانیوں کے ہوتے ہوئے اور زندگی کے مفید اور صحیح منصوبوں کو لیکر ان کی بے بسی کے پیش نظر، اخروی اور ابدی کمال کا سبب نہیں بن سکتے؛ اور دوسری طرف خدائے حکیم سے یہ بعید بلکہ محال ہے کہ وہ انسان کو

اختیاری اعمال کے ذریعہ ابدی سعادت تک پہنچنے کے لئے خلق کرے اور پھر تمام انسانوں کو اس سلسلہ کی ضروری شناخت فراہم نہ کرے۔

لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ الٰہی حکمت کا تقاضا یہ ہے وہ ضروری شناخت کو تمام انسانوں کے اختیار میں قرار دے اور ایسے راستے کو معین کرے کہ اس سے انسان ہدف کو اور اس تک پہنچنے کے طریقہ کو پہچان سکے اور یہ راہ وحی و نبوت کے سوا کچھ نہیں ہے۔[7] قرآن کریم نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے: رُسُلاً مُّبَشِّرِ ینَ وَ مُنذِ رِینَ لِئَلَاَّ یَکُو لِلنَّا سِ عَلَیَ اللَّہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ: یہ سارے رسول بشارت دینے والے اور ڈرانے والے اس لئے بھیجے گئے تا کہ رسولوں کے آنے کے بعد خدا پر انسانوں کی حجت قائم نہ ہونے پائے۔[8]

(ھ) دوسرے زاویئے سے زندگی کی راہنمائی میں عقل کی ناقص کارکردگی کو اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اچھائی اور برائی اور ان کی تشخیص کا منبع نہ تو جذبات و احساسات ہیں اور نہ ہی محض باہمی سمجھوتہ اور قرارداد اور نہ ہی امر الٰہی بلکہ خارجی اور حقیقی مفاہیم ہیں۔ البتہ مفاہیم ماہوی کے لحاظ سے نہیں جو عینی اور مستقل اشیاء کے لحاظ سے ہیں بلکہ مفاہیم فلسفی کی طرح کے حقائق مدنظر ہیں جو خارجی منشا انتزاع رکھتے ہیں یعنی حسی جمال کے سلسلہ میں اس نظریہ کے عین مطابق جو کہ جمال و زیبائی کو دو چیزوں کے درمیان کا تناسب سمجھتا ہے، وہ بھی دو اشیاء عینی و خارجی کا تناسب نہ کہ دو ذوق اور دو مزاجوں کا تناسب۔ اخلاق اور اچھائی اور برائی کی تشخیص کے سلسلہ میں بھی اسی طرح کی بات ہے حقیقت عینی و خارجی جو کہ ایک طرف انسان کا اختیاری فعل ہے اور دوسری سمت عینی و حقیقی کمال بھی ہے ایسی حقیقت کے بارے میں کہیں گے کہ جو عمل بھی انسان کے مطلوبہ کمال تک پہنچانے میں کام آجائے وہی اچھا ہے اور جو عمل انسان کو مطلوبہ کمال سے دور کرے وہی برا

ہے۔ اس بنیاد پر انسان کے اختیاری عمل کی خوبی، درحقیقت خود اس عمل اور مطلوبہ کمال کے درمیان مقایسہ کے ذریعہ سمجھ میں آتی ہے اور انسان کے ذوق و مزاج اور سمجھوتہ و قرارداد کی تابع نہیں ہے۔

یہاں تک، اچھائی برائی کی تشخیص کا معیار اگرچہ عقل سمجھی گئی لیکن چونکہ کمال کی تشخیص میں ہم دشواری سے روبرو ہیں اور پھر بہت سی جگہوں پر افعال اور نتائج کا رابطہ ہمیں معلوم نہیں ہے، کیونکہ ہر شخص اپنے اعتبار سے کمال نہائی کو کچھ بھی سمجھ سکتا ہے مثلاً ارسطو نے انسان کے کمال کو تین قوانین یعنی غضبیہ، شہویہ اور عاقلہ کے اعتدال میں سمجھا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ انسان کی عقل کمال نہائی کو درست سمجھ لے یا پھر کمال نہائی اور انسانی افعال کے درمیان کے رابطہ کو صحیح طور سے درک کر لے یعنی یہ سمجھ لے کہ فلاں عمل مطلوبہ کمال تک پہنچنے میں کون سی خاص تاثیر رکھتا ہے؟ آیا وہ عمل اس سے دور کرتا ہے یا اس سے قریب کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ دو طرح کی خطاؤں سے بچنے کے لئے یعنی مطلوبہ کمال اور اس تک پہنچنے کے راستے کی شناخت کے لئے شریعت کا دامن اور وحی کا ہاتھ پکڑنا چاہئے۔[9] خلاصہ یہ کہ اعمال اور کمال نہائی کے باہمی رابطہ کے سلسلہ میں جو چیز عقل کے ہاتھ لگتی ہے وہ ایک کلی مفہوم ہے جو کسی مصداق اور اخلاقی دستور کی تعیین میں کسی خاص کام کی نہیں مثلاً عقل سے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ عدل و انصاف اچھی چیز ہے یا عبادت اچھی چیز ہے لیکن فلاں جگہ پر عدل و انصاف کا کیا تقاضا ہے اور کس جگہ پر کونسا کام منصفانہ ہے اس کے لئے عقل ہمیں کوئی واضح راستہ نہیں دکھا سکتی۔ یا عقل کہتی ہے کہ اللہ اور صاحب نعمت کی عبادت اور شکر کرنا چاہئے لیکن یہ عبادت اور شکر کس طرح ہونا چاہئے؟ اس کو عقل اکیلی نہیں بتا سکتی۔

اس کلی بیان کے بعد اب ہم تمام منابع کو ایک ایک کر کے بیان کرتے ہیں:

عقل

گذشتہ بیان کی بنیاد پر عقل اگرچہ اخلاقی احکام کے صحیح نتائج حاصل کرنے کے لئے وحی کی محتاج ہے لیکن اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ عقل کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے کیونکہ عقل کے مفید اور متعدد کارنامے بھی ہیں جن میں سے بعض کو ہم ذکر کررہے ہیں:

عقل اور اخلاقی احکام کا بامعنی ہونا

کیا حقائق ہمیشہ ایک ہی رہتے ہیں اور کبھی بدلتے نہیں یعنی اگر کوئی چیز حقیقت رکھتی ہے تو ہمیشہ کے لئے حقیقت ہے اور اگر نہیں ہے تو ہمیشہ کے لئے جھوٹ ہے۔ اس سلسلہ میں مسلم دانشمندوں کی نظر یہ ہے کہ اخلاقی احکام ہمیشہ ایک مفہوم رکھتے ہیں؛ یہ ایک عقلی بحث ہے اور اس کے سمجھنے کے لئے عقل ہی ذریعہ ہے کہ اخلاقی مفاہیم، مطلق ہیں یا نسبی ہیں۔

عقل کا تمام احکام کی تحصیل کا ماخذ ہونا

اخلاقی احکام کے بامعنی ہونے اور اسی طرح قرآن وسنت سے ایک حکم اخلاقی کی تحصیل کے بعد اس پر عمل کے وجوب کے لئے عقل کے محتاج ہیں۔ مثلاً شریعت نے والدین کے احترام کو واجب قرار دیا ہے اور جو اس پر عمل نہ کرے وہ دنیوی اور اخروی عذاب میں مبتلا ہوگا، یہ درحقیقت ایک عقلی قضیہ ہے اگرچہ اس کے مقدمہ کو شریعت سے لیا گیا ہے۔ اسی طرح عقل ہمارے لئے اخلاق پر عمل پیرا ہونے کو لازم قرار دیتی ہے کہ اگر اخلاق نہ ہوتو معاشرہ اور سماجی روابط سرد پڑ جائیں گے اور امن و امان کے ساتھ اچھی زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔

لہٰذا اخلاق میں عقل کے منبع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مستقلات عقلیہ میں عقل ہی اوامر ونواہی اور اخلاق کے کلی اصول کو بیان کرتی ہے۔

اس کے علاوہ خود ایک مومن انسان کا ایمان بھی عقلی، حقیقی اور استدلال پر استوار ہونا چاہئے۔[10]

قرآن

قرآن کو دین کی شناخت کے لئے اصلی منبع کے طور پر دیکھا جاتا ہے، قرآن میں اس بات کی متعدد مقامات پر تاکید کی گئی ہے کہ اللہ بندوں کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ: میرے رسول نے تمہیں ایسی چیز سکھائی اور ایسے مطالب کو بیان کیا جن تک تم خود نہ پہنچ سکتے تھے اور نہ ہی انہیں حاصل کر سکتے تھے [وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾][11] اللہ نے یہ نہیں کہا کہ [عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٩﴾: ایسی چیز سکھائی جو تم جانتے نہیں تھے] بلکہ کہا کہ ایسی چیز تم کو سکھائی جس کے سیکھنے کا تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں تھا یعنی ایسے مطالب تھے جو تمہارے عام ادراک سے بالاتر تھے۔ انسانی حس، خود انسان، انسانی خیال اور انسانی عقل اس تک دسترس نہیں رکھتی تھی۔ قرآن میں یہ تعبیر کبھی ایک حکم کے بیان کے بعد آئی ہے یعنی پہلے ایک حکم بیان کیا گیا ہے پھر یہ عبارت یا اس مضمون کی آیت کہ تم ان احکام و دستورات تک اپنی عقل کے ذریعہ نہیں پہنچ سکتے تھے۔[12] اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسانی عقل تمام انسانی ضروریات کو پورا کرنے پر قادر نہیں تھی اور اگر آسمانی کتاب نہ ہوتی تو انسان اپنی عقل کے ذریعہ کسی طرح بھی بہت سے حقائق تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اسی طرح یہ کتاب اپنے اندر عالم فطرت کی طرح بہت سے رموز چھپائے ہوئے

ہے اس فرق کے ساتھ کہ یہ تشریعی دنیا ہے اور عالم تکوین وفطرت کے برخلاف اپنے اسرار کے اظہار کے لئے ایک زبان بھی رکھتی ہے اور سالہا سال سے اپنی گویا زبان کے ذریعہ انسان کو بہترین راہ کی دعوت دیتی رہی ہے اور دے رہی ہے۔

لہٰذا عقل ہم کو صرف بعض حقائق تک پہنچاتی ہے اور عقل کی ہدایت کردہ چیزوں میں سے یہ ہے کہ: میں بہت سی چیزوں کے درک سے عاجز ہوں چونکہ اس کے درک کے مقدمات میرے اختیار میں نہیں ہیں، لہٰذا یہی عقل ہمارے ہاتھ کو اپنے خالق کے ہاتھ میں دے دیتی ہے اور کہہ دیتی ہے کہ اگر اس سے آگے جانا ہے تو اس کتاب کی راہنمائی میں جائیں۔

خلاصہ یہ کہ اگرچہ عقل، مستقلات عقلیہ میں اوامر ونواہی اور اخلاق کے اصول کلی کی تعریف کرتی ہے لیکن اخلاقی مصادیق کی تعیین اور باریک اورظریف نکات کے لئے ہم قرآن وسنت کے محتاج ہیں۔

سنت

اگرچہ سنت بھی دین اور منجملہ اخلاق کی شناخت کا ایک منبع ہے لیکن ذہن میں رکھنا چاہئے کہ سنت درحقیقت قرآن ہی کی شرح ہے چاہے یہ سنت اقوال معصوم ہو اور چاہے ان کے افعال؛ سنت ہر حال میں قرآن کریم کی آیات کے مضامین کا بیان اور ان کی ہی شرح ہے کیونکہ قرآن نے اپنی جامعیت پر خود شہادت دی ہے کہ قیامت تک جس چیز کی بھی انسان کو ضرورت پڑے گی وہ سب اس میں بیان کردیا ہے۔[13]

البتہ شریعت کے اس منبع سے استفادہ اور اس سے قوانین احکام کی تحصیل کے لئے اس کی روش اور طرز وطریق سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ اور قرآن سے استفادہ اور بہرہ

مندی کے طریقہ کو سنت میں تلاش کرنا چاہئے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ سنت کے بغیر قرآن انسان کی سعادت کے لئے کافی نہیں ہوگا؛ چونکہ:

اولاً: قرآن، کلی قوانین سے سرشار ہے اور قرآن سے استفادہ کے طریقہ کو سنت سے سمجھنا چاہئے؛

ثانیا: صرف اچھا قانون سعادت کے لئے کافی نہیں ہوسکتا بلکہ باریکی اور ماہرانہ طریقہ سے اس کا نفاذ ضروری ہے۔ اور درحقیقت ہے کہ قرآن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کو اسوہ حسنہ کے طور پر پیش کرنا اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہترین قانون ایک ماہر اور سمجھدار نافذ کرنے والے کا ضرورتمند ہے، جب تک کوئی قانون عملی نہ ہوجائے تب تک اس کی شیرینی اور قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوسکتا لیکن جب نافذ کرنے والے قانون اور اس کے مقام کو درک کرتے ہوئے اسے اچھی طرح معاشرہ میں عملی کردیں گے اور سب اس کے بابرکت پھل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو سب کو اس کی خوبی اور بزرگی کا اندازہ ہوجائے گا۔

شہود

اشراق وشہود تیسری راہ ہے جو حس و تعقل کے بعد ہے۔ گویا ظاہر بین لوگ حس کے ذریعہ، تفکر کرنے والے استدلال کے ذریعہ اور روشن بین لوگ عالم بالا کے الہام و اشراق کے ذریعہ حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔[14]

شہود ایک نوری حقیقت شناسی ہے اور علمی راہوں سے اس کے امکان کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی تجرباتی مطالب کو حواس کے ذریعہ، عقلانی مطالب کو منطقی اور ریاضی افکار

کے ذریعہ اور حس و استدلال کے ماورا مطالب کو الہام اشراق کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے۔

مغربی دانشمندوں میں سے [الکسیس کارل] وہ ہے جس نے شہود کو کافی اہمیت دی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ: یہ بات یقینی ہے کہ علمی انکشافات صرف انسانی فکر کا نتیجہ اور ثمرہ نہیں ہے اور مطالعہ و قضایا فہمی کی قوت کے علاوہ نوابغ کے پاس دیگر خصوصیات مثلاً اشراق بھی ہوتا ہے۔ اشراق کے ذریعہ ان چیزوں کو پالیتے ہیں جو دوسروں پر پوشیدہ ہیں، ان قضایا کے درمیان کے ارتباط کو سمجھ لیتے ہیں جو آپس میں ظاہرا کوئی ربط نہیں رکھتے، اور مجہولات کی گرہ کو بھی اپنی فراست کے ذریعہ دیکھ لیتے ہیں۔ اس طرح کبھی ہم کو عقل و وحی وغیرہ کے علاوہ دوسرے راستوں سے بھی خارجی دنیا اور اخلاقی اصول سے آشنائی حاصل ہوجاتی ہے۔

آج انسان کے وجود و روح کے ان زاویوں کے لئے علم [میٹا فیزک] ہے۔ خصوصاً انسانی وجود کے ان پہلوؤں کا مطالعہ کرتا ہے جو ابھی اچھی طرح پہچانے نہیں گئے ہیں یعنی بعض لوگوں کے زیادہ اور اچھے درک و ادراک کو ہمارے لئے مدلل کرتا ہے۔[15]

کبھی کچھ حقائق اور پنہاں امور انسان کے دل میں اتر جاتے ہیں اور انسان کا ذہن اس طرح روشن ہوجاتا ہے کہ اسے یقین ہوجاتا ہے کہ جو وہ مجھ رہا ہے وہی صحیح اور یقینی ہے یعنی کشف کردہ چیز کی حقیقت کو دیکھ لیتا ہے۔ حقیقت اس طرح اس کے سامنے ہوتی ہے کہ انسان کے لئے کچھ شک و شبہ نہیں رہتا۔

البتہ چونکہ ممکن ہے کہ جو انسان کے لئے کشف ہورہا ہے وہ حقیقت کا صرف ایک جز ہو یا ممکن ہے کہ روحانی پیچیدگیوں اور غلط خیالات کے سبب اس چیز کی ماہیت کو ہم اچھی طرح درک نہ کرسکیں دوسرے لفظوں میں ممکن ہے الہام شدہ شے ہمارے ذہن و روح میں برعکس، اثر چھوڑے؛ اس وجہ سے یہ توجہ رکھنا چاہئے کہ علم شہودی اور باطنی ادراکات میں بھی خطا کا امکان ہے، لہٰذا مکاشفات کے صدق و کذب اور جن کا صادق ہونا ضروری نہیں ہے

ان نتائج کے صدق و کذب کو جاننے کے لئے خاص قسم کی تحقیق اور معیارات کی ضرورت ہے۔[16]

شہود جس طرح مغربی مکاتب فکر مثلاً [ٹومس ریڈ][17] یا [ایکوینس اور ایگوسٹین][18] کے مکتب میں پیش کیا گیا ہے ویسا ہمارے اخلاقی مکتب میں پیش نہیں کیا گیا۔ ہم شہود کو عرفان اسلامی میں زیر بحث لاتے ہیں اور اسے اس علم کا ایک مسئلہ شمار کرتے ہیں۔

بہرحال تہذیب نفس اور عرفان اسلامی میں آئے شہود کے ذریعہ اخلاقی مفاہیم کا کشف اور مشاہدہ کیا جاسکتا ہے مثلاً ایک انسان اپنے دل کی آنکھ سے خود کو اور تمام موجودات عالم کو فقر محض پاتا ہے۔

جو لوگ خلوص کے ساتھ اور دین کی بنیاد پر اللہ کی شناخت کے درپے ہیں ان کے سلسلہ میں قرآن فرماتا ہے: جو لوگ ہمارے لئے جہد و کوشش کرتے ہیں۔ بیشک ہم ان کو اپنی راہ کی ہدایت کریں گے اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔[19]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اگر کوئی اس پر عمل کرے جو جانتا ہے تو خدا اس کا علم بھی اسے عنایت فرماتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔[20]

اس مسئلہ کے اچھی طرح واضح ہونے کے لئے ہم عرفان اسلامی کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتے ہیں:

عرفان اسلامی کی دو قسمیں ہیں: عملی اور نظری؛

عرفان نظری عالم ہستی یعنی اللہ، کائنات اور انسان کی تفسیر کرتا ہے اور ان موارد کے علمی و عملی مسائل کو زیر بحث لاتا ہے۔ عرفان اس لحاظ سے فلسفہ کی طرح ہے۔ اس کا دوسرا حصہ عرفان عملی ہے جو اخلاق کی طرح ہے اور وہ انسان میں تبدیلی لانا اور اسے آگے بڑھانا چاہتا ہے؛ عرفان عملی یہ بتاتا ہے کہ انسان کو توحید کے بلند و بالا چوٹی تک پہنچنے کے لئے کہاں

سے ابتداء کرنا چاہئے اور کن کن منزلوں کو بالترتیب طے کرنا چاہئے اور اسے ان منزلوں کے درمیان کن حالات سے دوچار ہونا پڑے گا اور کون سے واقعات پیش آئیں گے۔ اور ان مراحل اور منازل کو ایک ایسے انسان کامل کی نگرانی میں انجام پانا چاہئے جو پہلے اس راہ کو طے کر چکا ہو اور منزلوں کی راہ و رسم سے آگاہ ہو۔ اور اگر ایک کامل انسان اس کا راہنما نہ ہو تو بھٹکنے کا خطرہ اس کی تاک میں ہے:

ترک این مرحله بی همرہی خضر مکن

ظلمات است بترس از خطر گمراہی [21]

[اس مرحلہ کو ایک خضرِ راہ کے بغیر ترک نہ کرنا۔ اندھیرا ہے لہٰذا بھٹکنے کے خطرے سے ڈرو]

نتیجہ یہ ہوا کہ: اخلاق تین میدانوں: ۱۔ بامعنی ہونے ۲۔ اخلاقی احکام کے استنباط و استخراج ۳۔ اعمال کی حقیقت کے درک اور نفاذ کی ضمانت کے لئے سعی و کوشش میں مذکورہ منابع کا ضرورتمند ہے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ضرورت ہر منابع میں الگ الگ طرح کی ہو یعنی تینوں منابع میں ایک منبع کا ضرورتمند ہو لیکن دوسرے منبع کی ضرورت صرف ایک یا دو میدانوں میں ہو۔

حواشی

[1] استاد ہادی تھرانی، باور ہا و پرسشہا قم، خانہ خرد، ص ۹۵۔

[2] زابینہ اشمیکتہ، اندیشہ ہای کلامی علامہ حلی، ترجمہ احمد نمایی، ص ۱۱۶ بنیاد پژوہش ہای اسلامی رضوی ۱۳۷۸۔

[3] عباس مرتضوی، علم و عقل از دیدگا مکتب تفکیک، ص ۱۸۹، مرکز جھانی علوم اسلامی ۱۳۸۱۔

[4] ایضا

[5] محمد تقی مصباح یزدی، معارف قرآن، ج ۴ و ۵ راہنما شناسی (ص ۱۰، مؤسسہ آموزشی و پژوھشی امام

خمینی ۱۳۸۲۔

[6] ایضاص ۱۱۔

[7] ایضاص ۱۵

[8] نساء آیہ ۱۶۵

[9] محمد تقی مصباح یزدی، فلسفہ اخلاق، ص ۸۰۔ ۸۲، موسسہ آموزشی و پژوھشی امام خمینی ۱۳۸۱

[10] مارتین مکدرموت، اندیشہ ہای کلامی شیخ مفید، ص ۷۱ مؤسسہ مطالعات اسلامی دانشگاہ مک گیل شعبہ دانشگاہ تھران، ۱۳۶۳۔

[11] بقرہ، ۱۵۱۔

[12] ہادونی تھرانی، باورھا و پرسشہا، قم خانہ خرد، چاپ سوم ۱۳۸۲ ص ۴۸

[13] ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شئ ؛نحل، ۸۹۔

[14] انسان موجود ناشناختہ ص ۱۳۵ تا ص ۱۳۷ بہ نقل جعفر سبحانی اگاہی سوم ص ۵۰۔

[15] ایضا۔

[16] آیت اللہ جودی آملی، شریعت در آینہ معرفت، قم، مرکز نشر فرھنگی رجاء، چاپ دوم ۱۳۷۲، ص ۱۳۷۔

[17] شہریاری، حمید، فلسفہ اخلاق در تفکر غرب از دیدگاہ السدیر مک اینتاید، تھران، سمت، چاپ اول ۱۳۸۵ ص ۲۱۵۔

[18] ایضاص ۱۵۵ وص ۱۵۶

[19] عنکبوت ۶۹۔

[20] حر عاملی، وسائل شیعہ۔ ج ۲۷ ص ۱۶۴؛ علامہ مجلسی، بحار الانوار ج ۲، ص ۳۰، و ج ۶۵، ص ۳۱۲۔

[21] مزید معلومات کے لئے دیکھئے: مطہری، آشنائی با علوم اسلامی، تھران، چاپ سیزدھم، ۳۷ ج ۲ ص ۸۵ تا ص ۸۷۔

دوسرے ادیان کے پیروں کے ساتھ مسلمانوں کے صلح آمیز سلوک کے بارے میں قرآن مجید کا نظریہ کیا ہے؟

مختصر جواب

پرامن مذہبی بقائے باہمی اسلام کا ایک بنیادی نظریہ ہے اور قرآان مجید کی متعدد آیات نے اس نظریہ کی گوناگوں صورتوں میں اور صراحت کے ساتھ تاکید کی ہے قرآن مجید کے مطابق، مذہبی جنگ اور عقائد میں اختلافات کی وجہ سے لڑنے کا کوئی معنی نہیں ہے، جب کہ بعض دوسرے مذاہب میں اس چیز کا مشاہدہ ہوتا ہے،جیسے عیسا یئوں کی صلیبی جنگیں اسلام میں دوسرے ادیان کے پیروکاروں کے بارے میں کینہ و دشمنی رکھنے کی ممانعت کی گئی ہے اور دوسروں کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرنا غیر دینی طرز عمل ہے

قرآن مجید نے پرامن بقائے باہمی کے لئے مختلف راہیں بیان کی ہیں، جن میں سے چند اہم راہیں حسب ذیل ہیں:

1............عقیدہ اور فکر کی آزادی

2............مشترک اصولوں پر توجہ کرنا

3............نسل پرستی کی مذمت

4............ پرامن گفتگو

5............صلح و امن کی تجویز کا استقبال کرنا

6............اقلیتوں کے حقوق کو قبول کرنا

7............انبیاءؑ اور آسمانی کتابوں کو باقاعدہ طور پر قبول کرنا

8............بین الاقوامی امن

9............دوسرے ادیان کی برتری جوئی کے توہمات سے مبارزہ و مجاہدت کرنا

10............بین الاقوامی مسائل میں تعاون کرنا

سنگسار کے حکم کا تاریخی سابقہ کیا ہے؟ کیا اس زمانہ میں اس حکم کا نفاذ اسلام کے نقصان میں نہیں ہے؟

مختصر جواب

سنگسار یا رجم کا رواج اسلام سے پہلے والے اقوام و ادیان میں بھی تھا

اسلام میں بھی سنگسار ایک قسم کی سزا اور حد شرعی کے عنوان سے مسلم اور قطعی ہے یہ سزا بعض انتہائی سنگین جرائم کے لئے معین کی گئی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیم و آلہ وسلم سے نقل کی گئی بہت سی روایتوں میں اس کی تاکید کی گئی ہے

اس قسم کی سزا کے نفاذ سے اسلام کا مقصد، معاشرہ کی اصلاح، جرم واقع ہونے کی وجہ سے پیدا شدہ نا آرامیوں کا اندمال، مجرم کی تطہیر اور اس جرم کے سبب مرتکب ہوئے گناہوں کی بخشش، معشرہ میں عدل و انصاف کا نفاذ، بڑے اور کمر توڑ گمراہیوں کو روکنا اور معاشرہ کو بچانا ہے

اسلام کے مطابق زنائے محصنہ (شوہر والی عورت یا بیوی والے مرد کا زنا) کی سزا، خاص شرائط کے پیش نظر سنگسار (رجم) ہے

اگر کہیں پر اس حکم یا دوسرے احکام کا نفاذ اسلام کی توہین کا سبب بنے تو ولی فقیہ یا حاکم شرع، اسلام اور اسلامی نظامی کی مصلحتوں کے پیش نظر اس حکم کے نفاذ کی کیفیت میں

تصرف کرسکتا ہے یا اس کی اصل میں تبدیلی لاسکتا ہے

تفصیلی جواب

سنگسار یا رجم کے تاریخی سابقہ اور ریکاڈ کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کے لئے اسلام سے پہلے والی تاریخ کی کتابوں اور ادیان کا مطالعہ کرنا ضروری ہے اس وقت دستیاب گزشتہ ادیان کی قدیمی ترین کتابوں میں، رجم (سنگسار) کے بارے میں مجرم افراد کی سزا کے طور پر نام لیا گیا ہے تورات میں اس سزا کا بارہا ذکر کیا گیا ہے اور شادی سے پہلے زنا کرنے والی لڑکی کے بارے میں توریت میں آیا ہے:

...اس کے بعد لڑکی کو اس کے باپ کے گھر میں لایا گیا تا کہ شہر کے لوگ اسے سنگسار کریں یہاں تک وہ مرجائے، کیونکہ بنی اسرائیل میں اس نے قباحت کی تھی، اپنے باپ کے گھر میں زنا کیا تھا، تا کہ اس طرح اپنے درمیان سے شرارت کو دور کرے[1]

اس طرح شوہر والی عورت کے زنا اور اس کے برعکس کے بارے میں توریت میں آیا ہے: اگر کسی مرد کو شوہر والی عورت سے ہمبستری کرتے ہوئے پایا جائے یہ دونوں (جس مرد نے اس عورت کے ساتھ ہمبستری کی تھی اور وہ عورت) مرجائیں، اس طرح بنی اسرائیل سے شرارت کو دور کرو۔[2]

جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ ہجرت کی، بعض یہودی زنا کا حکم پوچھنے کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو سورہ مائدہ کی آیات نمبر 14 اور اس سے مربوط بعد والی آیات نازل ہوئیں

واقعہ یہ تھا کہ علاقہ خیبر کی معروف و مشہور عورتوں میں سے ایک عورت نے اس علاقہ کے اشراف مردوں میں سے ایک مرد کے ساتھ زنا کیا تھا جبکہ دونوں محصن (شادی شدہ) تھے لیکن یہودی علماء ان دونوں کے سماجی مقام و منزلت کی وجہ سے انہیں سنگسار نہیں

کرنا چاہتے تھے اس لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ اگر اس سے کم تر سزا کا حکم ہو تو اس کو عملی جامہ پہنائیں، لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی وہی حکم بیان فرمایا اور فرمایا کہ یہ حکم توریت میں بھی آیا ہے، اس پر عمل کیوں نہیں کرتے ہو؟ انہوں نے توریت میں اس حکم کے موجود ہونے سے انکار کیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کے ابن ہوریا نامی ایک عالم کو بلوایا اور اسے قسم دینے کے بعد اس مطلب کے بارے میں اس سے سوال کیا اس نے بھی صراحت سے کہا کہ یہ حکم توریت میں موجود ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مرد و زن کو مسجد مدینہ کے سامنے سنگسار کرایا [3]

اس حکم کے مطابق اسلام سے پہلے دوسرے ادیان اور اقوام کے درمیان کچھ فرق کے ساتھ قتل و رجم (سنگسار) کا حکم نافز ہوتا تھا

اسلام میں سنگسار کا حکم:

اگر چہ محصنہ (شادی شدہ) عورتوں کے لئے سنگسار کا حکم قرآن مجید میں واضح نہیں ہے، لیکن یہ مسئلہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت و سیرت سے ثابت ہے

امام علی علیہ اسلام نے ایک عورت کے بارے میں کوڑے اور سنگسار کا حکم نافذ کرتے ہوئے فرمایا: میں نے اس کو خدا کی کتاب کے حکم کے مطابق کوڑے لگائے اور رسول اللہ کی سنت کے مطابق سنگسار کیا [4] خلیفہ دوم سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا، اگر میں اس چیز سے نہ ڈرتا کہ لوگ یہ کہیں گے کہ فلانی نے قرآن مجید میں ایک آیت کا اضافہ کیا ہے، تو میں رجم کی آیات کو لاتا کہ، پیر مرد اور پیر زن اگر زنا کریں انہیں حتماً سنگسار کرنا (البتہ قرآن مجید میں اس آیات کے وجود کو تمام صحابہ نے مسترد کیا ہے، یہاں تک کہ دو افراد نے اس آیات کے وجود کی شہادت نہیں دی ہے) [5]

زنائے محصنہ (شادی شدہ مرد و زن کے زنا) کے عنوان سے سنگسار کا حکم آیا ہے اور

اس پر تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے[6] چونکہ یہ حکم اسلامی حدود میں ہے، اس لئے یہ قابل مصالحت وشفاعت نہیں ہے یہاں تک کہ طرفین کی شکایت یا کسی اور شخص کی شکایت کے بغیر بھی نافذ ہونا چاہیئے[7]

چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیغمبر رحمت و مہربان ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زنائے محصنہ انجام دینے والے افراد کی طرف سے آپ (ص) کے سامنے چار بار اقرار کرنے کے بعد حکم سنگسار کو نافذ کرنے میں اظہار ناراضی کرتے ہوئے فرماتے تھے: اگر یہ افراد اقرار کے بجائے توبہ کرتے، تو ان کے لئے بہتر تھا (ماعز کا ماجرا) لیکن اگر یہ جرم ثابت ہوتا تو بادل ناخواستہ اس کو نافز فرماتے تھے

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام علی علیہ سلام کے زمانے میں سنگسار شدہ افراد کے واقعات اور اس سلسلہ میں نقل کی گئی روایتوں [8] سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا نظریہ ہمیشہ اس اصول پر تھا کہ اس گناہ کو ثابت کرنے کے لئے انتہائی سخت اور مشکل قیود وشرائط رکھ کر اس زنائے محصنہ کے اس گناہ کو ثابت کرنے کے امکانات کو کم از کم حد تک پہنچا دیا جائے اور یہ حکم نافذ ہوجائے تا کہ اس کی قباحت بھی کم نہ ہو اور افراد بھی سنگسار نہ ہوں

اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین میں، جو فقہ شیعہ کی بنیاد پر لکھا گیا ہے، میں بھی زنائے محصنہ کے ثبوت کے بارے میں یہی شرائط ہیں، ان میں سے بعض کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے:

1 دفعہ نمبر 74: زنا، خواہ سنگسار کا سبب بنے یا کوڑے مارنے کا، چار عادل مردوں کی شہادت یا تین عادل مردوں کی شہادت اور دو عادل عورتوں کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے[9]

2 دفعہ نمبر 76: گواہوں کی شہادت، واضح، بغیر ابہام اور مشاہدہ (آنکھوں سے

دیکھتے) کے استناد پر ہونی چاہئے

2 دفعہ نمبر 78: گواہوں کی گواہی کی بات میں زمان و مکان کے لحاظ سے خصوصیات بیان کرنے میں اختلاف نہیں پایا جانا چاہئے، ورنہ تمام گواہوں کو تہمت لگانے کے جرم میں کوڑے لگائے جائیں گے

4 دفعہ 79: گواہوں کو بیچ میں فاصلے ڈالے بغیر شہادت دینی چاہئے (ورنہ تمام گواہ حد قزف یعنی تازیانے کھانے کے مستحق ہوں گے)[10]

حتی اگر ملزم اقرار کے بعد انکار کرے تو اس سے سنگسار (رجم) کی حد ساقط ہوتی ہے امام جعفر صادق علیہ اسلام نے فرمایا ہے: اگر کوئی شخص ایسے گناہ کا اقرار کرنا چاہے، جو حد جاری کرنے کا سبب بنتا ہو، اور اس کے بعد انکار کرے، تو اس پر حد (تازیانہ) جاری کرنا چاہیے، مگر جو گناہ (زنائے محصنہ) سنگسار، (رجم) کی حد جاری کرنے کا سبب بنتا ہے، اس انکار کے بعد سنگسار نہیں کیا جا سکتا ہے[11]

سنگسار کا سبب بننے والے گناہ کے ثابت ہونے کے لئے اس قدر زیادہ اور سخت شرائط ہیں کہ بعض لوگوں نے کہا ہے[12] کہ شائد کبھی اس قسم کا جرم ثابت نہیں ہوگا، مگر یہ کہ کوئی شخص اپنی عقل و اختیار سے اس کا اعتراف کرے

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس قسم کی سزا کو شرعی جواز دینے میں اسلام کا مقصد انتقام لینا اور تشدد ایجاد کرنا نہیں ہے بلکہ اسلام کے دوسرے قوانین کے مانند اس قسم کی سزاؤں کو معین اور نافذ کرنے میں کچھ بلند مقاصد ہیں کہ ان میں سے چند کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

الف: معاشرہ کی اصلاح: جب قانون ایسا ہو کہ (شرائط پورے ہونے کی صورت میں) زنائے محصنہ کے مرتکب افراد کو کسی لحاظ کے بغیر اس قسم کی سخت سزا دی جائے، تو

دوسرے لوگ جو اس قسم کا جرم کرنے کے خطرہ سے دوچار ہونے والے ہوں، شدید ترین سزا سے آگاہ ہونے کے بعد ہرگز گناہ کے مرتکب نہیں ہوں گے

ب: ارتکاب جرم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ناآرامیوں کا عکاج: معاشرہ میں جو بھی جرم انجام پاتا ہے وہ ایک قسم کی ناآرامی پیدا کرتا ہے جو معاشرہ کے نظم وضبط کو درہم برہم کرنے کا سبب بن جاتا ہے اور سماج کو مشکل اور اضطراب سے دوچار کرتا ہے سزا کو جاری کرنے کا سب سے پہلا اثر، معاشرہ میں جرم انجام پانے کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ناآرامیوں کا اتدارک ہونا ہے

ج: مجرم کی تطہیر اور اس کے گناہوں کی بخشش: گناہ ایک قسم کی پلیدی اور آلودگی ہے اور اس کا مرتکب ہونا گناہکار کے آلودہ ہونے کا سبب بن جاتا ہے یہ آلودگی صرف اس کی تلافی، تنبیہ اور اس کے متناسب سزا سے پاک ہوتی ہے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ایک گناہ کی سزا جاری کرنے سے، گناہکار شخص اس گناہ کی آلودگی سے پاک و پاکیزہ ہوتا ہے حق الناس کے علاوہ بہت سے گناہ حقیقی توبہ سے بخش دیئے جاتے ہیں

د: معاشرے کا تحفظ: معاشرہ میں ارتکاب جرم ہونے پر اگر مجرم کو سزا نہ دی جائے تو مجرموں کی ہمت افزائی اور ان میں جرات پیدا ہونے کا سبب بن جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں معاشرے میں جرم وظلم اور لوگوں کے مال و جان اور ناموس پر ڈاکہ ڈالنے کے واقعات پھیلنے اور معاشرہ میں ناامنی پھیلنے کا سبب بن جاتا ہے جبکہ اسلام کے معین کردہ حدود اور سزا کو صحیح معنوں میں اور بر وقت نافذ کرنے سے پاک اور باتقویٰ انسانوں کی ہمت افزائی اور انسانی اصول اور قدروں کی رعایت کا سبب بن جاتا ہے اس کے علاوہ حدود اور سزا کا نفاد موقع پرست مجرموں اور بدکاروں کے لئے ایک تنبیہ ہے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں وہ کس سزا سے دوچار ہونے والے ہیں اور اس جرم کے مرتکب نہ ہوجائیں اور سرانجام معاشرہ میں

جرم و گناہ کی شرح کم ہوکر معاشرہ میں امن و امان کی حالت بڑھ جاتی ہے

ھ: معاشرہ میں عدل و انصاف کا نفاذ: دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا اور ان پر ظلم کرنا جرم و گناہ کا ارتقاب ہے عادلانہ سزا نافذ کرنے سے معاشر میں عدل و انصاف برقرار ہوتا ہے، یعنی اگر کوئی ظلم واقع ہوتو اس کی تلافی کے لئے اس کے متناسب سزا مقرر کی گئی ہے پس ہر سزا، کی کچھ خوبیاں ہیں کہ سنگسار (رجم) اس سے مستثنیٰ نہیں ہے

شاید سنگسار، (رجم) کو انتہائی (جرائم کو) روکنے والے حکم کا نام دیا جاسکتا ہے، یہ ایک ایسا حکم ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ اسلام کی پوری حکومتوں کے دوران صرف چند افراد کے بارے میں اور وہ بھی مجرم کے خود اعتراف جرم کرنے پر جاری ہوا ہے

البتہ، اگر بعض مواقع پر حدود کو جاری کرنا اسلام کی بنیاد کو نقصان پہنچنے کا سبب بن جائے تو معصوم امامؑ اور ولی فقیہ کو اختیار ہے کہ وہ اسلام کے اہم اتر منافع کے تحفظ کے لئے، حدود کو عارضی طور پر روک سکتے ہیں یا ان حدود کے سلسلہ میں بعض دوسری صورتوں کو نافذ کر سکتے ہیں

حضرت امام خمینی (رح) فرماتے ہیں:.....حاکم اس مسجد اور مکان کو منہدم کر کے اس کے پیسے مالک کو دے سکتا ہے، جو سڑک کے بیچ میں آتے ہوں، حاکم ضرورت پڑنے پر مسجد کو بند کر سکتا ہے اور حاکم ہر عبادی یا غیر عبادی امر جو اسلام کی مصلحت کے خلاف ہو، کو تب تک روک سکتا ہے، جب تک یہ خلاف مصلحت حالت باقی رہے مملکت اسلامی کی مصلحت کے خلاف ہونے کے موقع پر، حج جیسے اہم فرائض الٰہی کو حکومت تعطیل کر سکتی ہے[13]

ایک دوسری جگہ پر فرماتے ہیں:.....لوگوں کے لئے اس سادہ قضیہ کو واضح کرنا چاہئے کہ اسلام میں نظام کی مصلحت ان مسائل میں سے ہے کہ جو تمام چیزوں پر مقدم ہے اور ہم سب کو اس کے تابع رہنا چاہئے[14]

اس بنا پر کہنا چاہئے کہ: اگرچہ احکام الٰہی کے نفاذ کے سلسلے میں بعض محافل اور سیاسی گروہوں اور افراد کی طرف سے کئے جانے والے بے بنیاد اعتراضات کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے، لیکن اگر کسی موقع پر ایسے حکم کا نفاذ اسلامی نظام کی مصلحت کے خلاف ہو تو ولی فقیہ کو اختیار ہے کہ وہ اس حکم کو کسی دوسری صورت میں نافذ کرنے کا فرمان صادر کرے

حواشی

[1] کتب عهد عتیق، طبع لندن، ص373، (سفر توریتھ، مشنی، فصل بیست و دوم آیہ 22و21).

[2] کتب عهد عتیق، طبع لندن، (سفر توریھ، مشنی فصل بیست و دوم آیہ 23).

[3] ترجمہ فارسی المیز ان، علامہ طباطبائی، ج5، ص543و544.

[4] نقدو تفریعات: ایت اللہ سید محمد وحیدی (رح)، ص29.

[5] انوار الفقاھھ، ناصر مکارم شیرازی، کتاب حدود، ص281.

[6] جواھر الکلام، نجفی، ج4، ص318، المقاصد الشرعیہ للعقوبات فی اسلام، دکتر حسنی الجندی، ص637.

[7] تاثر زمان و مکان بر قوانین جزائی اسلام، حمید دھقان، ص129.

[8] وسائل الشیعہ، حد عاملی، ج18، 347.

[9] تحریر الوسیلتھ امام خمینی (رح)، ج2، ص461، مسالتھ9.

[10] شرح قانون مجازات اسلامی، سید فتاح مرتضوی، ص32 تا43.

[11] وسائل الشیعھ، ج18، ص318و319.

[12] تاثیر زمان و مکان بر قوانین جزائی اسلام، حمید یھقان.

[13] حکومت اسلامی، امام خمینی (رح)، ص233و34.

[14] ایضاً، ص464.

قرآن مجید کے کتنے سورے حیوانوں کے نام پر ہیں؟

مختصر جواب

قرآن مجید میں مندرجہ ذیل پانچ سورے ایسے ہیں جو حیوانوں کے نام پر ہیں:

1 سورہ بقرہ (گائے)، 2 سورہ نحل (شہد کی مکھی)، 3 سورہ نمل (چیونٹی)، 4 سورہ عنکبوت (مکڑی)، 5 سورہ فیل (ہاتھی)[1]

ان سوروں کی فضیلت کے بارے میں کہا گیا ہے:

1 سورہ بقرہ: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ قرآن مجید کے کونسے سورے اور آیات زیادہ فضیلت کے حامل ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: سورہ بقرہ اور آیت الکرسی[2]

2 سورہ نحل: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص سورہ نحل کی تلاوت کرے خداوند متعالی اسے دنیا میں عطا کی گئی نعمتوں کے بارے میں قیامت کے دن حساب نہیں لے گا[3]

3 سورہ عنکبوت: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص سورہ عنکبوت کی تلاوت کرے گا، خداوند متعال اس کے نامہ اعمال میں مومنین و منافقین کی تعداد میں سے ہر ایک کے برابر دس ثواب لکھے گا[4]

سورہ نمل: امام جعفر صادق علیہ اسلام نے فرمایا: جو شخص شب جمعہ میں سورہ شوریٰ، سورہ نمل اور سورہ قصص کی تلاوت کرے گا وہ خدا کا ولی بن جائے گا[5]

سورہ فیل: امام جعفر صادق علیہ اسلام نے فرمایا: جو شخص اپنی واجب نمازوں میں سورہ فیل کی تلاوت کرے گا تو قیامت کے دن پہاڑ صحرا اور ریگستان اس کے حق میں گواہی دیں گے کہ وہ نماز گزار تھا[6]

سورہ فیل اور سورہ ایلاف دونوں ملا کر ایک ہی سورہ شمار ہوتا ہے، اس لئے اگر ہم نماز میں سورہ حمد کے بعد سورہ فیل کو پڑھنا چاہیں تو ہمیں سورہ فیل کے بعد سورہ ایلاف بھی پڑھنا چاہیئے[7]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مزکورہ تمام فضیلتیں اور اس کے علاوہ جو فضیلتیں قرآن مجید کے سوروں اور آیات کے بارے میں بیان کی گئی ہیں وہ اس صورت میں ہے کہ قرآئت کے ضمن میں ان سورتوں اور آیات پر تدبر اور فکر و اندیشہ بھی کیا جائے تا کہ اس کی روشنی میں انسان کی روح و جان سیراب ہو جائے[8]

حواشی

[1] میرزا باقر حسینی، آشنائی وانس با قرآن، انتشارات حرم، ص 43.

[2] ایضاً، ص 232.

[3] ایضاً، ص 237.

[4] ایضاً، ص 241.

[5] عزیزی، عباس، فضائل و آثار قرائت سورہ ہا، انتشارات ارم، ص 47.

[6] ایضاً، ص 114.

[7] تحریر الوسیلہ، ج 10، القول فی القرائھ والذکر، مسالہ 6.

[8] تفسیر نمونہ، ج 5، ص 144.

کیا کتاب شریف کافی کی احادیث قرآن مجید کی آیات کی تفسیر ہوسکتی ہیں؟

کیا (شیعہ) یہ نہیں کہتے ہیں کہ کتاب کافی کی اکثر حدیثیں ضعیف ہیں اور ہمارے پاس قرآن مجید کے علاوہ کوئی چیز صحیح نہیں ہے؟! پس اس بات کے بعد کیوں جھوٹ بولتے ہیں کہ کافی قرآن مجید کی شرح وتفسیر ہے، وہی کافی جس کی اکثر احادیث ان کے اپنے اعتراف کے مطابق ضعیف ہیں؟

مختصر جواب

کتاب کافی کے مولف، محمد بن یعقوب کلینی، شیعوں کے عظیم فقیہ اور مکتب امامیہ کے موثق ترین محدثین میں سے تھے۔ وہ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ شریف کی غیبت صغریٰ کے ہمعصر تھے اسی لئے ان کی اکثر روایات کافی اعتبار کی حامل ہیں۔ اگر چہ احادیث کے دوسرے مجموعوں کے مانند کتاب کافی میں بھی بعض کم اعتبار والی روایتیں پائی جاتی ہیں۔

شیعوں اور اہل سنت کے نظریہ کے مطابق روایات کے مجموعوں اور کتابوں میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم اسلام سے بہت ساری ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں جو قرآن مجید کی آیات کی تفسیر بیان کرتی ہیں۔

تفصیلی جواب

اس سوال کے جواب کے سلسلے میں مناسب ہے کہ ہم پہلے کتاب کافی کے بارے میں کچھ وضاحت کریں اور اس کے بعد اس کتاب کی روایتوں کے قابل اعتبار ہونے کے بارے میں بحث کریں گے۔

شیعوں کے منابع میں کتاب کافی کی خصوصیات اور اس کی اہمیت:

اس کتاب کے مصنف، عظیم محدث محمد بن یعقوب کلینیؒ، شیعوں کے ایک بڑے فقیہ اور مکتب امامیہ کے موثق ترین محدثین میں سے شمار ہوتے ہیں جو امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ شریف کی غیبت صغریٰ کے زمانہ میں زندگی بسر کرتے تھے اور امام عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ شریف کے آخری نائب خاص کی وفات سے پہلے سن 328 ہجری قمری میں وہ اس دنیا سے چلے گئے۔ ان کی کتاب یعنی کافی بذات خود ایک دائرۃ المعارف اور کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب شیعوں کی احادیث کی اہم ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور شیعوں کی کتب اربعہ (کافی، تہذیب، استبصار، من لا یحضر ہ الفقیہ) میں سے ایک شمار ہوتی ہے۔ مرحوم کلینیؒ نے اس کتاب کی قابل قدر احادیث کو بیس سال کی مدت میں جمع کیا ہے۔ یہ کتاب، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم اسلام کی احادیث پر مشتمل ہے، جن میں اسلامی علوم و معارف کے بارے میں بہترین صورت میں اشارہ کیا گیا ہے اور انہیں ایک خوبصورت انداز اور ترتیب سے پیش کیا ہے۔

چونکہ کتاب کافی کا شعیوں کے ابتدائی اور معتبر منابع کے ساتھ زمانہ کے لحاظ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا اور اس کی احادیث کو بلا واسطہ ان سے حاصل کیا گیا ہے اس لئے ان میں کافی احتیاط اور دقت کی گئی ہے اور شیعوں میں قابل اعتبار ہے۔ گزشتہ ایک ہزار سے زیادہ عرصہ کے دوران شیعہ علماء وفقعہا نے اس کی طرف خاص توجہ کی ہے اور شیعہ مصنفین نے

اپنی تالیفات میں ہمیشہ اس کتاب سے استناد کیا ہے۔

شہید ثانی نے فرمایا ہے: کافی کی احادیث صحاح ستہ کی احادیث کے مجموعہ سے زیادہ ہیں، کیونکہ کافی کی احادیث کی تعداد 16199 ہے جبکہ ابن اثیر کے جامع الاصول میں بیان کے مطابق صحاح ستہ کی احادیث کی مجموعی تعداد 9483 ہے [1]

اس کتاب اور اس کے احادیث کی قابل اعتبار ہونے کے سلسلے میں شیعہ علما اور دانشوروں نے بہت کچھ اور مفصل بیان کیا ہے، جس کو تفصیل سے یہاں پر ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے ہم یہاں پر ان تائیدوں کے ایک خلاصہ کو بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

شیخ مفیدؒ نے اس کتاب کے بارے میں فرمایا ہے: کافی، شیعوں کی کتابوں میں بہترین اور مفید ترین کتاب ہے۔[2]

محمد بن مکی معروف بہ شہید اول (رح) نے کافی کے بارے میں فرمایا ہے: کتاب کافی، احادیث کی ایک ایسی کتاب ہے، جس کے مانند شیعوں کے پاس اور کوئی کتاب نہیں ہے۔[3]

علامہ فیض کاشانیؒ نے فرمایا ہے: کافی شیعوں کی احادیث کی سب سے قابل قدر، قابل اعتماد، کامل اور جامع کتاب ہے، کیونکہ اس میں تمام اصول موجود ہیں اور کوئی چیز اضافی نہیں ہے[4]

علامہ مجلسی (رح) نے فرمایا ہے: کتاب کافی احادیث کے اصول کی کتابوں میں کامل اور جامع ترین کتاب ہے اور شیعوں کے توسط سے لکھی گئی بڑی کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔[5]

نتیجہ کے طور پر شیعوں کے معروف نظریہ کے مطابق کافی کی اکثر روایتیں اعتبار

کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہیں، اگرچہ احادیث کے دوسرے مجموعوں کے مانند اس میں بھی بعض کم اعتبار والی روایتیں پائی جاتی ہیں۔

شیعوں کا اعتقاد ہے کہ جس کتاب کی تمام باتوں پر پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے، وہ صرف قرآن مجید ہے۔

لیکن علم رجال کی کسوٹی پر نہ اترنے والی بعض ضعیف روایتوں کی وجہ سے قابل اعتبار روایتوں سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی ہے۔ کتاب کافی، من جملہ ان کتابوں میں سے ہے کہ اس کی اکثر روایتیں قابل اعتبار ہیں اور کیا یہ کہنے میں کوئی مشکل ہے کہ ان روایات میں سے بہت سی قابل اعتبار روایتیں قرآن مجید کی شرح وتفسیر بیان کرتی ہیں؟

اس کے علاوہ شیعہ اور اہل سنت کے نظریہ کے مطابق احادیث کی کتابوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم اسلام سے کئی اور قابل اعتبار احادیث پائی جاتی ہیں جو قرآن مجید کی آیات کی تفسیر وتشریح کرتی ہیں۔

واضح ہے کہ اس قسم کی قابل اعتبار احادیث، قرآن مجید کی تفسیر تک پہنچنے کی بہترین راہ ہیں، کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم اسلام خدا کی کتاب اور اس کے معارف کے بارے میں آگاہ ترین افراد ہیں۔

حواشی

[1] المدخل الی علم الرجال والدرایہ، ص 138

[2] سافٹ ویئر درایہ النور

[3] بحار الانوار، ج 25، ص 67

[4] بحار الانوار، ج 25، ص 67

[5] مرآۃ العقول، ج 1، ص 3

کیا روح موت کے بعد دنیا کے امور اور حوادث سے آگاہی حاصل کرسکتی ہے؟

مختصر جواب

قرآنی آیات اور معصومین علیہم السلام کی روایات سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ روحیں موت کے بعد، دنیا میں لوٹ کر اپنے رشتہ داروں کے حالات وغیرہ سے آگاہ ہوتی ہیں۔ اور اس کام میں فرشتوں کے کردار کی نہ صرف نفی نہیں کی گئ ہے بلکہ اس پر تصدیق بھی ہوئی ہے۔

روایات میں آیا ہے:

۱۔ بے شک مومن اپنے گھر والوں کی زیارت کرتا ہے۔ پس جو کچھ وہ پسند کرتا ہے وہ دیکھتا ہے اور جو کچھ اسے برا لگتا ہے اس سے وہ پوشیدہ رکھا جاتا ہے

۲۔ خداوند متعال ایک فرشتے کو اس کے ساتھ روانہ کرتا ہے تا کہ اسے ایسی چیزیں دکھائے جن سے وہ خوش ہو جائے۔۔۔

تفصیلی جواب

سوال کا جواب واضح ہونے کے لئے مندرجہ ذیل نکات کی جانب توجہ کرنا ضروری ہے:

۱۔ انسان کے دو پہلو ہیں روح اور بدن۔ اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ

انسانوں کی روح ایک حقیقت ہے۔

انسان کی روح، ایک ایسا جوہر ہے جو مجرد (مادہ سے خالی) زندہ اور قادر، جاننے والا اور با اختیار ہے کہ جسے نفس ناطقہ یا روان کہا جاتا ہے۔[1]

روح کا بدن سے تعلق تدبیری ہے، یعنی روح کی حیات بالاصالہ ہے، اور جب تک کہ وہ بدن سے متعلق ہوتی ہے بدن بھی اسی سے اپنی حیات لیتا ہے۔ اور جب وہ بدن سے مفارقت اختیار کرلیتی ہے تو بدن اپنی حیات سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ بوسیدہ ہوجاتا ہے۔ اور روح اپنی حیات کو جاری رکھتی ہے۔[2]

۲۔ موت کے بعد والی زندگی کے بارے میں عقلی تحقیقات کلی مطالب جیسے روح کی بقاء یا معاد کی ضرورت کو ثابت کرتی ہیں۔ لیکن موت کے بعد کے جزئی مسائل کو وحی کے ذریعے یا ائمہ معصومین علیہم السلام کے بیانات سے جانا جا سکتا ہے۔

۳۔ اس سلسلے میں وارد شدہ آیات قرآنی اور روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی روح موت کے بعد دنیاوی مسائل سے آگاہی حاصل کرتی رہتی ہے۔

نمونہ کے طور پر اس سلسلے میں چند روایات کی جانب توجہ کریں:

ا۔ اسحٰق بن عمار نے امام موسی کاظم علیہ السلام سے پوچھا: کیا مؤمن اپنے گھر والوں کی زیارت کرتا ہے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: بے شک، میں نے عرض کیا: کتنا؟ تو فرمایا: اپنے فضائل کے مطابق، ان میں بعض ہر دن اور بعض ہر تین دن میں ایک مرتبہ۔

اسحاق بن عمار کہتا ہے کہ امام کے کلام کے دوران میں نے یہ سمجھا کہ فرمایا: ان میں سب سے کم ہر جمعہ (کو اپنے گھر والوں کی زیارت کرتا ہے)۔، میں نے عرض کیا کہ کس وقت؟ فرمایا: جب سورج کے زوال کا وقت ہوتا ہے، یا اس کے مانند، خداوند متعال اس کے ساتھ ایک فرشتہ بھیجتا ہے کہ وہ ایسی چیزیں اس کو دکھائے جن سے وہ خوش ہوجائے اور بعض

چیزیں اس سے پوشیدہ رکھے جو اس کو غمگین کرتی ہیں۔[3]

2: امام صادق نے فرمایا: بے شک مومن اپنے گھر والوں کی زیارت کرتا ہے، پس جو کچھ وہ پسند کرتا ہے وہ دیکھتا ہے اور جو کچھ اس کو اچھا نہیں لگتا اس سے وہ پوشیدہ رہتا ہے۔ اور بے شک کافر بھی اپنے گھر کی زیارت کرتا ہے۔ اور اس کو جو برا لگتا ہے وہ دیکھتا ہے اور جو اس کو پسند ہوتا ہے وہ اس سے پوشیدہ رہتا ہے۔ امام نے فرمایا: بعض ان میں سے ہر جمعہ کو زیارت کرتے ہیں، اور بعض اپنی عمل کے مطابق زیارت کرتے ہیں [4]

۴۔ چونکہ فرشتے علتوں کے طولی سلسلوں میں قرار پائے ہیں اور من جملہ اسباب الٰہی ہیں، کوئی دور کی بات نہیں کہ ارواح خداوند متعال کے امر سے عالم دنیا کی طرف لوٹ آئیں اور اپنے رشتہ داروں کے احوال سے باخبر ہوجائیں۔۔۔ اور اس سلسلے میں فرشتے واسطہ کے طور پر اپنا کام انجام دیں، جیسا کہ روایات میں اس کی جانب اشارہ ہوا ہے۔

حواشی

[1] جہاان پر روح اور جسم کے رابطہ کی بات ہے اور ان دو کا ایک دوسرے پر متقابل اثر کی بات ہے وہاں اس کا نام روان رکھا جاتا ہے اور جہان پر روح کے امور جسم کے علیحدہ مورد بحث واقع ہوتے ہیں اس کا نام روح رکھا جاتا ہے۔

[2] ترجمہ المیزان، ج ۱۹ ص ۳۴۴۔

[3] مجلسی، بحار الانوار، ج ۶ ص ۳۶۸۔

[4] کلینی، کافی، ج ۳ ص ۲۳۰۔

فرشتوں کی عمر کتنی ہے؟ کیا مقرب فرشتے بھی مرجائیں گے؟ کس طرح؟

مختصر جواب

روایات کے مطابق فرشتوں کی خلقت، حضرت رسول اکرمﷺ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کے ارواح کی خلقت کے بعد تھی۔ وہ سب حتی کہ جبرائیل، اسرافیل اور دوسرے خدا کے مقرب ملائکہ، قیامت سے پہلے مرجائیں گے۔ ملائکہ کے مرنے کی کیفیت کے بارے میں ممکن ہے مراد، ان کے مثالی جسم سے روح کا نکلنا اوران کی کارکردگی کا ختم ہونا ہو۔

تفصیلی جواب

متعدد روایات کی بنا پر ملائکہ سب سے پہلی مخلوق ہیں کہ جنہیں خداوند متعال نے خلق کیا ہے۔ کیونکہ ہماری احادیث میں آیا ہے کہ فرشتوں کی خلقت، حضرت رسول اکرمﷺ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کے نور کی خلقت کے بعد وجود میں آئی ہے[1]

اور اسی طرح متعدد احادیث کی بنا پر پروردگار کی پہلی مخلوق حضرت رسول اکرمﷺ اور ائمہ اطہار علیہم السلام کا پاک نور تھا۔ اس کے بعد خداوند متعال نے زمین اور آسمانوں کو خلق کیا اوراس کے بعد ملائکہ کو خلق کیا۔

جابر بن عبد اللہ انصاری نقل کرتے ہیں: اور میں نے رسول اکرمﷺ سے سنا

ہے کہ آپ نے فرمایا: بے شک خداوند متعال نے مجھے، علی فاطمہ، حسن اور حسین اور باقی ائمہ اطہار کو ایک نور سے خلق کیا، اس کے بعد ہمارے پیرو کاروں کو۔۔۔اس کے بعد آسمانوں اور زمینوں کو اور ملائکہ کو خلق کیا۔۔۔[2]

لیکن ملائکہ کی موت کے بارے میں، چونکہ زمینوں اور آسمانوں کے سب موجودات قیامت سے پہلے مرجائیں گے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: اور جب صور پھونکا جائے گا تو زمین و آسمان کی تمام مخلوقات بیھوش ہوکر گر پڑیں گی علاوہ ان کے جنہیں خدا بچانا چاہے، اس کے بعد پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب کھڑے ہوکر دیکھنے لگیں گے [3]

اس آیہ شریفہ کی ابتدا میں ارشاد ہے کہ جو بھی زمین اور آسمان میں ہیں وہ سب مر جائیں گے جو سب موجودات حتی کہ ملائکہ بھی اس میں شامل ہوتا ہے، اس کے بعد آیہ شریفہ نے بعض کو مستثنی کیا ہے۔جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ بعض مخلوقات پہلے صُور میں نہیں مریں گی۔لیکن وہ کون سی مخلوقات ہیں؟ مفسرین نے اس بات میں اختلاف کیا ہے:

بعض کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ بعض، بزرگ فرشتے جیسے جبرئیل، میکائیل اسرافیل اور عزرائیل ہیں، ایک روایت کے مطابق، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسم نے اس آیہ کی تلاوت کی تو لوگوں نے پوچھا، کہ کون مستثنی ہیں۔آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت۔اور جب سب مخلوقات کی روح قبض کی جائے گی اس کے بعد وہ بھی خداوند متعال کے فرمان سے ترتیب کے ساتھ مرجائیں گے [4]

دوسری روایت میں حاملان عرش کو ان ملائکہ پر اضافہ کیا گیا ہے۔[5]

بہر حال یہ روایت [6] اور دوسری روایات جو بیان کرتی ہیں: جب پہلا نفخِ صور ہوجائے گا اسرافیل صور پھونکے گا اور سب موجودات جو روح رکھتے ہیں مرجائیں گے، بغیر اسرافیل کے اور اس کے بعد اسرافیل بھی خدا کے امر سے مرجائے گا۔[7]

بعض آیات شریفہ من جملہ: **كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ** [8] جو بیان کرتی ہے کہ ہر چیز ہلاک ہوجائے گی اور مر جائے گی سوائے ذات خدا کے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ باقیماندہ فرشتے بھی آخر کار مر جائیں گے، اور پورے عالم میں کوئی ذات زندہ نہیں رہے گی سوائے پروردگار کی ذات کے۔

فرشتوں کے لئے کس طرح موت آتی ہے؟ اس سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے، کہ جو کچھ ہم موت کے بارے میں سمجھتے ہیں (مادہ اور جسم سے روح کا نکلنا) موت کا یہ تصور، ملائکہ کے بارے میں معنی نہیں رکھتا، کیونکہ وہ جسم نہیں رکھتے ہیں کہ اس جسم سے روح کا خارج ہونا، معنی رکھتا ہو۔ اس لئے فرشتوں کی موت کے بارے میں مندرجہ ذیل احتمالات ہیں:

پہلا احتمال: انکے بارے میں موت کا مطلب، مثالی جسم سے روح کا الگ ہونا ہے۔

دوسرا احتمال: مراد انکے کام کو روکنا اور انکے ادراک کی صلاحیتوں کو کھونا ہے۔[9]

اس بنیاد کے مطابق فرشتے طویل عمر کے مالک ہیں لیکن وہ بھی ایک دن مر جائینگے۔

حواشی

[1] بحار الانوا، جلد ۱۵، صفحہ ۸ اور جلد ۱۸ صفحہ ۳۴۸، وجلد ۲۴، صفحہ۔ ۸۸۔

[2] بحار الانوار، ج ۳۶۔ ص ۳۴۴۔ و ۳۴۳۔

[3] سورہ زمر، ۶۸۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ

[4] بحار الانوار، ج ۷۹، ص ۱۸۴۔

[5] بحار الانوار، ج ۶، ص ۳۲۹۔

[6] بحار الانوار، ج ۶۔ ص ۳۲۹۔

[7] بحار الانوار، ج ۶۔ ص ۳۲۴۔

[8] سورہ قصص۔ ۸۸۔

[9] تفسیر نمونہ، ج ۱۹، ص ۱۴۵ ص

خدا بعض بندوں کو بھول جاتا ہے۔ اس جملے کا کیا مطلب ہے؟

جو بات بعض آیات میں بیان ہوئی ہے کہ خداوند متعال دنیا اور آخرت میں بعض بندوں کو بھول جاتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے کیا واقعی خدا بھول جاتا ہے؟

مختصر جواب:

خداوند متعال نے قرآن مجید میں، چار مرتبہ بندوں کو بھول جانے کی نسبت اپنی طرف دی ہے، جیسا کہ آیہ شریفہ میں فرمایا ہے آج ہم انہیں اسی طرح بھلادیں گے جس طرح انہوں نے آج کے دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا[i]

یہ آیت اور اس جیسی آیات اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ آخرت میں (حتی کہ دنیا میں بھی) خدا بعض کو بھلا دے گا۔لیکن اس بھلا دینے کا مطلب کیا ہے؟ اسلام کے منابع میں موجود عقلی اور کلامی دلیلیں، خداوند متعال کی ذات سے ایسے بھلا دینے کی نفی کرتی ہیں جس کا مطلب مخلوقات کے احوال سے بے خبر رہنا ہو۔ بلکہ خود خداوند متعال نے فرمایا: کہ تمہارا پروردگار بھولنے والا نہیں ہے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خدا کے بھول جانے کا مطلب،غفلت اور عدم واقفیت نہیں ہے کیونکہ خداوند متعال سب خفی امور سے باخبر ہے بلکہ

اس سے مراد اُس رحمت الٰہی سے دوری ہے جس کے مخلوق محتاج ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: کہ خداوند متعال کے بھول جانے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کو اپنے خیر سے محروم کرتا ہے پس جہاں پر قرآن مجید میں، خدا کے بھول جانے کی بات ہوئی ہے اس کا مطلب بندے کو اپنے حال پر چھوڑ نا اور خداوند متعال کی عنایت کے سائے کو اس کے اوپر سے اُٹھا لینا ہے۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بندہ خدا کو بھول کر زیادہ دنیا کمانے میں مشغول رہتا ہے۔ دوسری عبارت میں خداوند متعال کا بھول جانا، دین کی نسبت بندے کی بےتوجہی اور بندے کا خدا کو بھول جانے کا تخلیقی نتیجہ ہے۔

[i] سورہ اعراف۔ ۵۱، فالیوم ننسا ہم کما نسوا لقاء یومہم ہذا۔

تفصیلی جواب

اس سلسلے میں پہلے ان آیات کو ذکر کریں گے جن کی بنیادوں پر یہ سوال پیش آتا ہے۔ پھر قرآنی، عقلی اور حدیثی دلیلوں کے ذریعے اس سوال کا جواب دیں گے، ہماری کوشش یہ ہوگی کہ سوال کی تشریح کر کے اس سلسلے میں موجود ابہام اور تناقض کو دور کریں۔

قرآن مجید میں بعض ایسی آیات موجود ہیں جو اس سوال کا پیش خیمہ بنتی ہیں کہ کیا خداوند متعال بعض بندوں کو فراموش کر دیتا ہے؟ یہ آیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ آج ہم انہیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح انہوں نے آج کے دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا

۲۔ اور ان سے کہا گیا کہ ہم تمہیں آج اس طرح نظر انداز کر دیں گے جس طرح تم نے آج کے دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور تم سب کا انجام جہنم ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں [1]

۳۔ کہ اسی طرح ہمای آیتیں تیرے پاس آئیں اور تو نے انہیں بھلا دیا تو آج تو

بھی نظر انداز کر دیا جائے گا [2]

۴۔ انہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ [3]

ان آیات میں خداوند سبحان واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ بعض اس کی بارگاہ میں بھلا دیئے جائیں گے ان آیات میں سے تین آیتیں روز قیامت کے بارے میں ہیں اور چوتھی آیت دنیا کے بارے میں ہے۔ اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ اولاً کیا خدا بھول جاتا ہے؟ اور کیا صفت نسیان (جس کے معنی خداوند متعال کے پاس کسی چیز کا حاضر نہ ہونا ہے) خدا کی نسبت دینا صحیح ہے؟

ثانیا: اگر یہ صحیح ہے تو اس کی کیفیت کو کس طرح بیان کیا جاسکتا ہے؟

اسلامی عقاید اور دینی اعتقادات کہ جو دلیل پر مبنی ہیں، میں پورے صفات سلبیہ کو من جملہ نسیان (بھول جانا) خداوند متعال سے سلب کیا جاتا ہے اور خداوند متعال جو کمال اور علم کے سب درجات کا حامل ہے ہر طرح کے نقص وفقدان سے پاک ہے اور یہ بات مفصل طور پر معتبر اعتقادی اور کلامی منابع میں عقلی، فلسفیانہ دلیلوں کے ذریعے ثابت ہوئی ہے اور اس کا تفصیلی بیان اس اختصار میں ممکن نہیں ہے۔ [4]

قرآن مجید بھی واضح طور پر خداوند متعال کو اس نقص سے مبرئ قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ تمہارا پروردگار بھولنے والا نہیں ہے [5]

دوسری جگہ فرماتا ہے۔ میرا پروردگار نہ بہکتا ہے اور نہ بھول جاتا ہے [6]

پس ان آیات شریفہ کے مطابق بھی خداوند متعال کی ذات بھول چوک سے منزہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جو آیات خداوند متعال سے بھولنے کی نسبت دیتی ہیں ان کے کیا معنی ہیں؟

ائمہ معصومین علیہم السلام کی روایات ہمیشہ قرآنی آیات کی تفسیر کر کے ان میں موجود مسائل کو ہمارے لئے حل کرتی ہیں۔ یہ روایات یہاں پر بھی اس ابہام کو دور کرتی ہیں، حضرت امام رضا علیہ السلام آیہ شریفہ فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ کی تفسیر میں ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ ننسا ہم یعنی ہم انہیں چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے قیامت اور اس دن کے لئے آمادہ رہنے کو چھوڑ دیا تھا ہم بھی اس دن انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیں گے [7] پس ہم سمجھتے ہیں کہ فراموش کرنے سے مراد رحمت اور عنایت کی نظر کو بندے سے اٹھالینے کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے بھی اس سلسلے میں فرمایا ہے: خدا کو بھول جانے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں خیر سے محروم کرتا ہے۔ [8]

اور حکیمانہ تدبیر عدالت کی بنیادوں پر اور بھولنے والوں کے چال چلن کے مطابق ہے خداوند متعال کی بہ نسبت ان بندوں کی مثال اس شاگرد کے مانند ہے کہ جس نے سال کے دوران اپنے سبق کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ اس نے اپنے سبق اور استاد کے مستقبل سے کھلواڑ کیا ہے اور اس نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو اسے اپنے حال پر چھوڑ کر امتحان کے دن اپنی حمایت اور مدد سے اس کو محروم رکھا ہے۔

البتہ اس نکتہ کی جانب توجہ کرنا ضروری ہے کہ خداوند متعال کے اپنے بندوں کی نسبت رحمت سے محرومیت کی شرط یہ ہے کہ بندے خدا کو بھول کر اپنے دین اور مذہب کے ساتھ کھلواڑ کر کے، دنیا میں مشغول اور مغرور ہو جائیں [9]

یعنی خدا اس کے بھولنے کا بدلہ بھولنے سے ہی دیتا ہے جیسا کہ خدا کی یاد جو نسیان کے مقابلے میں ہے فرماتا ہے: مجھے یاد کرو تا کہ تمہیں یاد کروں [10]

پس جو کچھ بیان ہوا کہ خداوند متعال نے بھولنے کو اپنی جانب نسبت دی ہے۔ اور دوسری جانب عقل اور قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو فراموشی غفلت اور ناآگاہی کا نتیجہ ہے

خداوند جو کہ کمال مطلق ہے اور وہ عالم الغیب جس کے علم کے احاطے سے ذرہ بھی باہر نہیں ہے، [11] کی نسبت محال ہے۔ پس خدا کی فراموشی سے مراد اس کی بے توجھی اور اس کی عنایت اور رحمت کا سایہ انسان سے اٹھنا اور خداوند متعال کی خیر و برکت سے محروم رہنا ہے، امید ہے کہ قرآن کی آیات میں تدبر کرنے کی توفیق روز بروز ہم خالی ہاتھ بندوں کو نصیب ہوجائے تا کہ خدا کی رحمت اور غفران ہم کو شامل ہوجائے۔

حواشی

[1] سورہ جاثیہ۔ ۳۴۔ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا

[2] سورہ طٰہٰ۔ ۱۲۶۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾

[3] سورہ توبھ۔ ۶۷۔ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۭ۔ سورہ توبہ۔ ۶۷۔

[4] القول السدید فی شرح التجرید، ص ۲۷۴۔ بہ بعد، اور عقاید اسلامی فصول، ۲۲۔۔ ۱۵۔

[5] سورہ مریم۔ ۶۴۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ○

[6] سورہ طٰہٰ۔ ۵۲۔ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾

[7] تفسیر نور بہ استناد نور الثقلین۔

[8] تفسیر نور بہ استناد تفسیر برھان،، سورہ توبہ، ۶۷۔

[9] سورہ اعراف سے اقتباس، آیت ۵۱۔ اور جاثیہ، ۳۵ اور ۳۴۔

[10] سورہ بقرہ، ۵۳، فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ

[11] سورہ سبا،۔ ۳ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳﴾ ۔۔۔۔

خدا کی نعمتوں کا شکر بجالانا کیوں واجب ہے؟

مختصر جواب:

لغت میں شکر کے معنی، ذہن میں نعمت کے تصور کرنے اور گفتار و کردار میں اس کے اظہار کرنے کے ہیں۔ خدا کی نعمتوں کا شکر واجب ہونے کے سلسلے میں چند نکات کی جانب توجہ کرنا ضروری ہے۔

ا۔ منعم کے لئے شکر کا واجب ہونا ایک فطری اور باطنی امر ہے۔ یعنی ہر انسان اپنی عقل اور فطرت کی طرف رجوع کر کے یہ سمجھ لیتا ہے کہ جس نے اس کی کوئی خدمت کی ہو یا کوئی نعمت عطا کی ہو، اس کے لے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے ۔ ورنہ عقل اس کو سزا کا مستحق قرار دیتی ہے۔ اسی تصور کو مدنظر رکھ کر، جب انسان یہ سمجھتا ہے کہ ایک مطلق اور لاثانی طاقت نے بے شمار مادی اور معنوی نعمتیں عطا کی ہیں، تو وہ ضروری جانتا ہے کہ اس لا یزال قدرت کو پہچان کر اس کا شکریہ ادا کرے۔ پس نعمت کا شکر بجالانا اس سے پہلے کہ شرعی واجب ہو ایک عقلی واجب ہے۔

۲۔ اگرچہ خداوند متعال بندوں کی شکر گزاری سے بے نیاز ہے، لیکن بندوں کی مصلحت اور منفعت کیلئے نیز مادی، معنوی، دنیاوی و اخروی نتائج کے لئے جو انسان کی شان اور مقام کے ہمراہ ہوتے ہیں، انہیں شکر گزاری کی دعوت دی ہے۔ قرآن کریم میں شکر گزاروں کی نعمتوں میں اضافہ کرنے کی خوشخبری کے بعد کفران نعمت کو عذاب الٰہی کا سبب جانا

ہے۔

۳۔شکر گزاری انسان کے لئے عظیم برکاتِ الٰھی ،اور تمام سعادتوں کی جڑ ھے، جو دن بہ دن انسان کو خدا سے نزدیک کرتا ہے اور بندوں کے اپنے خدا کے ساتھ عشق و محبت کی بنیادوں کو مضبوط کرتا ہے۔ اس لحاظ سے خدا کے بے نیاز ہونے کے باوجود بھی شکر گزاری حکمت اور مصلحت کے تحت بندوں کے لئے ضروری اور واجب جانی گئ ہے۔

۴۔ بے شک کوئی بھی خدا کی نعمتوں کا شکر بجا نہیں لاسکتا، اور انسان کا سب سے بڑا شکر، خدا کے سامنے اس کی نعمتوں پر شکر گزاری کے زریعہ ناتوانی کا اظہار کرنا اور اپنے عذر و تقصیر کو خدا کے حضور میں لے جانا ہے۔

تفصیلی جواب

لغت میں شکر ذہن میں نعمت کا تصور کرنے اور قول اور عمل میں اس کے اظہار کرنے کو کہتے ہیں [1]۔ اس سوال کے جواب میں کہ نعمت کا شکر کیوں واجب ہے کچھ نکات کی جانب توجہ کرنا ضروری ہے۔

۱۔ **منعِم** (نمت دینے والے) کا شکر بجا لانا ایک باطنی اور فطری چیز ہے۔ انسان اپنی عقل اور فطرت کی جانب رجوع کر کے اس حقیقت کو سمجھ لیتا ہے کہ جس نے بھی اسے کوئی نعمت عطا کی ہو یا کوئی خدمت انجام دی ہو (اگر چہ وہ خدمت اور نعمت چھوٹی ہی ہو) بے خیال نہ رہے اور کسی بھی طرح اس کا شکریہ بجا لائے اور اس کی قدردانی کرے، ورنہ عقل کی جانب سے وہ سزا کے قابل ہوگا اور عقلاء اس کی مذمت کریں گے، اور اسے حیوانوں سے پست تر جانیں گے۔ کیونکہ بہت سے حیوانوں میں شکر گزاری کی خصلت واضح ہے اسی حکم عقل کے مطابق جب انسان توجہ کرتا ہے کہ ایک لاثانی قدرت نے وجود کے سرمایہ اور دیگر بڑی قیمتی اور بے شمار مادی اور معنوی نعمتیں اس کو عطا کی ہیں تو وہ اپنے اوپر فرض جانتا ہے کہ

اس ولی نعمت کے لئے بے خیال نہ رہے اور جہاں تک اس کے لئے ممکن ہو اس کی نعمتوں کا شکریہ کر کے، اس کی کرامت، عظمت اور بزرگی کے مقابلے میں اپنا سر خم کرے اور اس کا شکر ادا کرے۔ اس طرح کی ذہنیت ہر انسان میں فطری طور پر موجود ہے جو ہر ایک پر اپنے **مُنعِم** کا پہچاننا واجب کرتا ہے، کیونکہ پہچاننے کے مرحلے کے بعد ہی قدردانی اور شکرگزاری ممکن ہوتی ہے۔ [2]

۲۔ شکرگزاری کے فلسفہ سے آگاہی، ہمیں نعمات الٰہی پر شکرگزاری کے واجب ہونے کی ہدایت کرتی ہے:

ممکن ہے کہ انسانوں کو بھی ان نعمتوں کے مقابلے میں جو وہ دوسروں کو عطا کرتے ہیں شکرگزاری کی توقع رہتی ہوگی، لیکن بے شک جو خدا ہر چیز سے بے نیاز ہے اگر پورا عالم اس کا انکار کرے تو اس کے کبریائی دامن میں ذرہ برابر فرق بھی نہیں آتا۔ اس کو بندوں کی شکرگزاری کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن اپنی بے نیازی کے باوجود بھی بندوں کے اوپر، مصلحت اور حکمت کے مطابق شکرگزاری کو واجب قرار دیا ہے اور قرآن کریم میں شکرگزاروں کو خوشخبری دی ہے اور ناشُکرے افراد کی طرف بے توجہی کر کے ارشاد کرتا ہے: جو خدا کا شکر کرے گا وہ اپنے ہی فائدے کے لئے شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی تو خدا تو بہرحال قابل حمد وثنا ہے۔ [3]

نعمت کی ناشکری کو شدید کا باعث جانتا ہے اور فرماتا ہے اور اگر تم ناشکری کرو گے تو بے شک میرا عذاب شدید ہے [4]

اگرچہ خداوند متعال اس سے عظیم ہے کہ ناشُکرے افراد کو محروم کرے، لیکن ناشکری خود بخود بعض چیزوں سے محروم ہونے کا سبب بنتی ہے جیسے نعمت کا زائل ہونا، خیر کا اٹھ جانا، نیز احسان، شجاعت، ایثار کے ختم ہونے کا سبب ناشکری ہی بنتی ہے اور منعم کی شکرگزاری

کے نتائج بے شک عظیم ہیں اور ہر انسان کو اس کی شان اور منزلت کے مطابق عطا ہوتے ہیں۔

پس شکر گزاری کے مسئلے پر اتنی تاکید کرنے کا فائدہ خود انسان کو ہوتا ہے اور اگر اس کے فلسفے کے بارے میں غور کریں تو اس کا واجب ہونا بھی واضح ہوتا ہے:

اولا) جو فرد یا قوم خدا کی نعمتوں کی قدر کرتی ہے چاہے شکر گزاری ان کے دل میں ہو یا زبان اور عمل میں، وہ یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ نعمت حاصل کرنے کے قابل ہیں۔ خداوند متعال کا کام بھی ہمیشہ حکمت کے مطابق ہوتا ہے خدا بغیر کسی وجہ کے نہ کسی سے نعمت لیتا ہے اور نہ کسی کو نعمت عطا کرتا ہے۔ آیات اور روایات اسلامی میں شکر نعمت کے دائمی اور زیادہ ہونے کا سبب جانا گیا ہے اور حدیث میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: شکر کا فائدہ، نعمت کا زیادہ ہونا ہے [5]

ثانیا) جب انسان کے اندر شکر گزاری کی روح پرورش پاتی ہے تو خالق کی شکر گزاری سے مخلوق کی شکر گزاری تک پہنچتی ہے اور مخلوق کی خدمت اور تکلیف کے مقابلے میں شکر گزاری اور شکریہ ادا کرنے سے انسان کی استعداد کھلنے لگتی ہے اور اس کے جوہر وجود کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں۔ اور نتیجہ کے طور پر سماج اور صاحبان نعمت میں خیر اور نیک کام انجام دینے کے لئے ان کے ارادے دوگنے ہوتے ہیں۔

ثالثا) خالق کی شکر گزاری، اس کی معرفت کے دروازوں کو کھولتی ہے اور خالق سے انسان کے رابطہ کو مضبوط بناتی ہے۔ شکر گزاری منعم اور نعمت کی معرفت کا سبب بنتی ہے اور یہ معرفت روز بہ روز خدا کے ساتھ بندوں کے رابطے کو بھی مضبوط کرتی ہے۔ اور اس کے عشق کی آگ کو دلوں میں بھڑکاتی ہے۔

۳۔ بے شک کسی فرد میں پوری نعمتوں پر شکر کرنے کی طاقت نہیں ہے کیونکہ

فکر، عقل، زبان، ھاتھہ، پاؤں، وغیرہ کی شکر گزاری کی توفیق کہ جس کے ذریعے انسان دلی، زبانی، اور عملی شکر بجالاتا ہے، یہ سب خدا کی نعمتوں کے ذریعے سے ہے اور یہ توفیق جب شکر گزاری کی راہ میں قرار دی جائے تو وہ ایک اور نعمت ہے جس پر ایک اور شکر کرنے کی ضرورت ہے اسی وجہ سے جیسا کہ اسلامی روایات میں اشارہ ہوا ہے انسان کا سب سے بڑا شکر نعمتوں کے مقابلے میں خدا کا شکر بجالانے میں ناتوانی کا اظہار ہے اور حق تعالیٰ کے حضور گناہ اور تقصیر کا اظہار کرنا ہے۔ ورنہ خدا کی خداوندی کا حق کوئی بھی ادا نہیں کرسکتا ہے۔[6]

نتیجہ یہ کہ: شکر گزاری نہ صرف فطری اور باطنی امر ہے بلکہ انسان کی تمام سعادتوں اور عظیم الٰہی برکات کا سرچشمہ ہے جو دن بہ دن انسان کو خدا سے نزدیک کرتا ہے اور خدا کے ساتھ بندوں کے عشق و محبت کو مضبوط بناتا ہے اور تقوی اور پرہیز گاری کا عامل، رستگاری اور سعادت کی جانب راستہ اور ذات خدا کے مقابلے میں انسان کی بندگی اور عبودیت کی معرفت کے لئے ایک نورانیت ہے اسی لئے خداوند متعال کے بے نیاز ہونے کے باوجود حکمت اور مصلحت کے عنوان سے شکر گزاری بندوں پر ضروری اور واجب قرار دی گئ ہے۔

حواشی

[1] مفردات راغب۔س ۲۶۵، لفظ شکر۔

[2] توحید از دیدگاہ عقل ونقل، جعفر کریمی، قدرت اللہ فرقانی، فصل لزوم شناخت خدا، تھوڑی تبدیلی کے ساتھہ۔

[3] سورہ لقمان۔ ۱۲ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾

[4] سورہ ابراھم۔ ۷ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ﴿۷﴾

[5] شرح فارسی غرر الحکم، جلد ۳۔ صفحہ ۳۳۸، ثمرہ الشر زیادۃ النعم۔

[6] مکارم شیرازی، ناصر اخلاق در قرآن، ج ۳ ص ۸۰ اور ۸۱۔

قرآن مجید میں تحریف نہ ہونے کی کیا دلیل ہے؟

مختصر جواب

وسیع معنی میں تحریف قرآن کا مفہوم کسی بھی طرح کی کمی زیادتی یا الفاظ وترکیبات کی جابجائی کو شامل ہوتا ہے۔ محققین نے قرآن کے تحریف سے پاک ہونے پر بہت سے دلائل قائم کئے ہیں۔ ہم یہاں پر ان میں سے صرف کچھ دلائل عقلی کو بیان کریں گے:

۱۔ قرآن شروع ہی سے کچھ خصوصیات مثلا امتیازی نظم، آیات کے درمیان نااختلافی، اور غیبی اخبار کا حامل رہا ہے اور اب بھی اس میں وہ خصوصیات موجود ہیں اور اب تک کوئی بھی اس کی طرح کا ایک سورہ بھی نہیں لا پایا ہے۔ لہٰذا ماننا چاہئے کہ چودہ سو سال پہلے اور آج کے قرآن میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۲۔ اگر کسی دین کو آخری دین ہونا ہوتو، اولاً اسے مکمل ہونا چاہئے (غیر خاتم دین کے برخلاف کہ وہ مکمل نہیں تھے)؛ ثانیا اس کے اندر تاریخ کے کسی حصہ میں کوئی تحریف نہیں ہونا چاہئے۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک خصوصیت نہ ہوتو عقل یہی کہے گی کہ یہ دین خاتم نہیں ہے۔ اور یہ واضح سی بات ہے کہ دین کی کتاب دین کے واضحات میں شمار ہوتی ہے جس میں تغییر تبدیلی نہیں ہونا چاہئے۔ لہٰذا قرآن اسلام کی کتاب ہے اور دین اسلام بھی دین خاتم ہے لہٰذا قرآن دین خاتم کی کتاب ہے اس بنا پر چونکہ دین خاتم کی کتاب کو تحریف سے پاک ہونا چاہئے لہٰذا قرآن بھی تحریف سے پاک ہے۔

۳۔اگر کوئی ایک مجموعہ کے طور پر اور موجودہ صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں جمع قرآن کے حوالے سے اختلاف رکھتا ہوتو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن میں نہ کسی لفظ کا اضافہ ہوا ہے اور نہ ہی کوئی لفظ کم ہوا ہے، کیونکہ اس وقت سے آج تک مسلمان اس کے حفظ اور حفاظت میں کوشاں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں قارئین، حافظین اور معلمین اس قدر زیادہ تھے کہ صرف بئر معونہ کے واقعہ میں تقریبا ۷۰ حافظین قرآن شہید ہوئے[i]۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سے آج تک ہر زمانے میں اور ہر علاقہ میں اچھے خاصے حافظ اور قاری و معلم قرآن موجود رہے ہیں۔ اور ان حالات کے پیش نظر قرآن تحریف کا احتمال بھی درست نہیں۔

۵۔ مورخین نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں وحی لکھنے والوں کی تعداد ۴۳ افراد لکھی ہے۔ ایسی صورت میں جب اتنے لکھنے والے موٴجد ہوں تو ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی اس میں تحریف کرنے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔

٦۔ اسلام کے تمام پیشواؤں نے یک زبان لوگوں کو موجودہ قرآن کی تلاوت، اس کی تحقیق اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے۔ یہ بات اس پت دلالت کرتی ہے کہ یہ آسمانی کتاب ہر زمانے میں یہاں تک کہ صدر اسلام میں بھی تحریف و ترمیم سے پاک ایک مجموعہ کی صورت میں رہی ہے۔

[i] سفینۃ البحار۔ ج۱،ص۵۷

تفصیلی جواب

کتب آسمانی کی تحریف ایک ایسا رائج مسئلہ ہے جو الہٰی ادیان میں پیدا ہوا ہے اس طرح کہ نئے انبیاء کی بعثت کا ایک ہدف اسی تحریف سے مقابلہ کرنا ہے۔[1] لیکن دین مقدس اسلام، آخری دین ہونے کے عنوان سے ہر طرح کی تحریف وتغییر سے پاک ہے۔

یہ سوال کہ [ہم کیسے یہ اطمیناں حاصل کریں کہ ۱۴ صدیوں میں قرآن کے اندر کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے] مختلف مبانی کے مدنظر پیش کیا جاسکتا ہے اور سوال کرنے والے کی طرف سے صرف تاریخ زاویہ کو مدنظر رکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔

اس سوال کا جواب دو زاویہ سے قابل ذکر ہے: ایک دین کا درونی زاویہ اور ایک دین کا بیرونی زاویہ۔ ہم یہاں پر ان روایات کو بالکل بیان نہیں کریں گے جو معصوم کی طرف سے اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں اور واضح طور سے قرآن کی تحریف ناپذیری کو بیانکرتی ہیں۔ بلکہ ہم صرف بیرونی نگاہ ڈالیں گے۔

پہلی دلیل: اعجاز قرآن

علامہ طباطبائی نے قرآن کے اعجاز کے ذریعہ اس کی تحریف ناپذیری پر استدلال کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: تاریخ کے مسلمات میں سے ہے کہ چودہ سو سال پہلے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نام کا یک پیغمبر مبعوث ہوا اور لوگوں کی ہدایت کے لئے ایک قرآن نامی ایک کتاب لیکر آیا جو اس کا ایک جاوید معجزہ تھی۔ قرآن آغاز اسلام ہی سے کچھ خصوصیات کا حامل تھا جو اس کے معجزہ ہونے پر دلیل تھے اور انہی خصوصیات کے ذریعہ وہ اپنے مخالفین اور دشمنوں کو چیلینج کرتا تھا۔ اسی طرح تاریخ میں یہ بھی محفوظ ہے کہ صدر اسلام میں کوئی بھی مخالف ایسا نہ تھا جو قرآن کی خصوصیات کا چھوٹا سا حتی ایک سورہ پیش کر سکے۔

جو قرآن آج ہمارے ہاتھوں میں ہے یہ امتیازی نظم، آیات کے درمیان نااختلافی وغیرہ کا حامل ہے یعنی چودہ سو سال پہلے والے قرآن کی تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں اور آج بھی کوئی اس کی خصوصیات (الفاظ کی ترکیب، آیات کے درمیان نااختلافی وغیرہ) والا سورہ نہیں لا سکا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ وہی ۱۴ صدیوں پہلے والا قرآن ہے کیونکہ اگر اس میں تحریف ہوئی ہوتی تو اس کے اوصاف باقی نہ رہتے۔[2] اگر انسان قرآن کے حتی چھوٹے

سے ایک سورے کا جواب لانے کی توازن رکھتا ہوتا تو عرب کے مشرکین اس کے سلسلہ میں زیادہ توانا تھے کیونکہ ان کی فصاحت و بلاغت اور عربیت وشعر وخطابہ کا سکہ چل چکا تھا، وہ اگر چاہتے تو اسلام سے اپنی دشمنی اور کینہ کے پیش نظر اور نئے اسلام کے مقابلہ کے لئے اپنے آپ کو اسی میں لگا دیتے اور قرآن کے چیلنج (حتی ایک سورے کا جواب لانے کی دعوت) کے مدنظر اپنے آپ کو دوسری طرح کی مزاحمت کرنے کی تکلیف نہ دیتے بلکہ صرف ایک سورہ کا جواب لاکر اسلام کے دعوے کو کھوکھلا ثابت کر دیتے۔ جیسا کہ دشمنوں نے اس سلسلہ میں بہت سی کوششیں کیں لیکن انہیں کامیابی نہ مل سکی کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ [اگر جن وانس جمع ہو جائیں اور اس قرآن کا جواب لے آئیں جو لا نہیں سکتے اگر چہ ایک دوسرے کا تعاون بھی کریں][3]۔

قرآن کے دیگر چیلنجوں میں یہ بھی ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہے: [کیا قرآن میں تدبر نہیں کرتے ہو؟ اگر اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پاتے]۔[4] موجودہ قرآن میں ہمیں کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔[5]

اسی طرح موجودہ قرآن میں وہ خصوصیات بھی بخوبی دکھائی دیتی ہیں جو پیغمبر کے اوپر نازل ہونے والے قرآن کے بارے میں نقل ہوئی ہیں مثلاً: غیبی خبریں، انبیاء کے واقعات، معارف اور ذکر الٰہی۔[6]

دوسری دلیل

یہ دلیل کچھ مقدمات سے ملکر بنتی ہے:

۱۔ دین مرسل وہ دین ہے جو اللہ کی طرف سے انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے۔

۲۔ ہر دین مرسل زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنی آخری منزل سے پہلے، دین

کامل کے کچھ دستورات کو انسان کی ہدایت کے لئے لاتا ہے۔

۳۔ادیان مرسل کے متعدد ہونے کی حکمت ایک تو یہ ہے کہ دین کامل (جو اللہ کے پاس ہے) میں سے کچھ دستورات کو لےکر آئے اور ایک یہ ہے کہ گزشتہ شریعت کے اس حصہ کی تصحیح کر دے جن میں تحریف ہوگئی ہے۔

۴۔ ادیان الٰہی کا سلسلہ کسی وقت ختم ہوجاتا ہے اور ایک دین [دین خاتم] کے عنوان سے ظاہر ہوجاتا ہے جو اولا کامل ہوتا ہے اس طرح کہ ہدایت کا کوئی گوشہ چھوٹتا نہیں ہے۔

ثانیا یہ دین تاریخ میں ہر طرح کی تحریف سے پاک ہو اور اگر ان میں سے کوئی ایک عنصر ختم ہوجائے تو عقل یہ کہے گی کہ یہ آخری دین نہیں ہے۔

ان مقدمات کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ: [دین خاتم، تحریف سے پاک ہے]۔[7] اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کتاب (اس کا اصلی اور بے بدل منبع) بھی تحریف سے محفوظ ہو اور یہ دین کے تحریف سے محفوظ ہونے کا لازمہ ہے۔[8]

یہاں تک یہ عقلی قاعدہ (کبری) ثابت ہوگیا کہ دین خاتم کی کتاب کو تحریف سے محفوظ ہونا چاہئے اور اگر اس قاعدہ کو مذکورہ دو مقدمہ کے نتیجہ (الف: قرآن اسلام کی کتاب ہے، ب: دین اسلام دین خاتم ہے؛ لہٰذا قرآن دین خاتم کی کتاب ہے) کے ساتھ ملائیں تو آخر میں یہ نتیجہ آئے گا: قرآن تحریف و تبدیلی سے محفوظ ہے۔[9]

قاعدتاً جب یہ مان لیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری پیغمبر ہیں اور اسلام آخری دین الٰہی ہے اور قرآن کے احکام دنیا کی انتہا تک برقرار رہیں گے؛ تو یہ سب ماننے کے بعد یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ اسلام اور خاتم النبیین کی واحد سند کی اللہ حفاظت نہیں کرے گا؟ کیا اسلام کی جاودانی اور ہزاروں سال بلکہ انتہائے جہان تک اس کی بقا کے ساتھ قرآن کی

تحریف کو تصور کیا جا سکتا ہے؟

تیسری دلیل

اگر ہم اسی پر غور کر لیں کہ قرآن تمام مسلمانوں کے لئے سب کچھ تھا۔ قانون اساسی، زندگی کا دستور العمل، حکومت کی منصوبہ بندی، آسمانی مقدس کتاب اور رمز عبادت تھا تو یہ واضح ہو جائے گا کہ اس میں کسی طرح کی کمی زیادتی ممکن ہی نہیں تھی۔

قرآن ایسی کتاب تھی جس سے مسلمان ہمیشہ نمازوں میں، مسجدوں میں، گھروں میں، میدان جنگ میں، دشمنوں سے روبرو ہوتے وقت اپنے مکتب کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے استفادہ کرتے تھے۔ حتی تاریخ اسلامی سے یہ بھی استفادہ ہوتا ہے کہ قرآن کی تعلیم کو عورتوں کی مہر قرار دیا جاتا تھا! اور بنیادی طور پر جو کتاب زندگی کے ہر شعبہ میں فعال تھی اور ہر بچہ زندگی کی ابتدا ہی سے جس کی آشنائی حاصل کرتا تھا اور اسلام سے کوئی درس حاصل کرنے کے لئے جس چیز کی تعلیم دی جاتی تھی وہ یہی قرآن کریم تھا۔ ان حالات کے تحت کیا کوئی یہ احتمال دے سکتا ہے کہ اس کتاب آسمانی میں کوئی تبدیلی ہوئی ہوگی؟[10]

چوتھی دلیل

قرآن اسی مجموعہ کے طور پر اسی موجودہ صورت میں رسول اللہ کے زمانے میں ہی جمع ہو چکا تھا۔[11] اگر کوئی اسے بھی قبول نہ کرے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ جن لوگوں نے سوروں کی ترتیب وغیرہ کے سلسلہ میں اختلاف کیا ہے انہیں بھی اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن میں نہ کوئی لفظ کم ہوا اور نہ کوئی لفظ زیادہ ہوا ہے۔ کیونکہ مسلمان اس کے حفظ اور یاد کرنے پر پابند تھے اور بنیادی طور پر اس زمانے میں لوگوں کی شخصیت کافی حد تک اسی سے پہچانی جاتی تھی کہ اسے قرآن کی کتنی آیات یاد ہیں۔

قرآن کے حافظین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ تاریخ میں ملتا ہے کہ ابوبکر کے زمانے

کی ایک جنگ میں چارسو حافظین قرآن قتل کئے گئے۔[12]

مدینہ کے قریب کی ایک آبادی بئر معونہ کے واقعہ اس علاقہ میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ہونے والی جنگ میں ہم پڑھتے ہیں کہ اس میں قارئین قرآن کی ایک بڑی تعداد جوتقریبا ۷۰ کے قریب تھی شہید ہوگئی۔[13]

اس سب سے واضح ہوتا ہے کہ حافظین، قارئین اور معلمین قرآن اتنے زیادہ تھے صرف جنگ کے میدان میں حافظین کی اتنی بڑی تعداد نے جام شہادت نوش کیا۔

قرآن ایسی کتاب نہیں تھی جو متروک ہوگئی ہو یا کسی مسجد میں بھول کی گرد وغبار چاٹ رہی ہو کہ کوئی اس میں کوئی چیز بڑھادے یا کم کردے۔

حفظ قرآن کا مسئلہ مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ ہی سے ایک سنت اور عبادت کے عنوان سے دیکھا گیا ہے۔حتی اس وقت بھی جب قرآن کے نسخے ایک کتاب کی شکل میں جگہ جگہ پھیل گئے اورحتی صنعت چھاپ کی ایجاد کے بعد بھی جس کے ذریعہ قرآن کو ایسی کتاب کا عنوان ملا جو اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ چھپتی ہو تب بھی قرآن کے حفظ کا مسئلہ ایک قدیم سنت اور فخر و امتیاز کی نگاہ سے دیکھا گیا اس طرح کہ ہر شہر اور علاقہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ حفاظ آباد رہے۔

اور اب بھی اسلامی ممالک میں بہت مدرسہ [مدرسہ تحفیظ قرآن کریم] یا کسی اور نام سے موجود ہیں جن کی سب سے پہلی منصوبہ بندی حفظ قرآن کے سلسلہ میں ہے حتی ان میں حفظ کا درس دینے والے وہ حافظین ہیں جو خود بہت کمسن ہیں۔[14]

بعض رپورٹیں بتاتی ہیں کہ پاکستان میں پندرہ لاکھ حافظ قرآن موجود ہیں۔[15]

مصر کی یونیورسٹی [الازہر] میں داخلہ کی ایک شرط خود مکمل حفظ قرآن ہے جس میں چالیس امتیازات میں سے کم سے کم بیس امتیازات حاصل کرنا ضروری ہیں۔[16] اور......

خلاصہ یہ کہ قرآن کے حفظ کی سنت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے زمانے سے اور مختلف روایات کے مطابق خود آپ کی سفارش اور حکم کے سبب ہر زمانے اور ہر عصر میں رہی ہے۔ کیا اس حال میں بھی یہ احتمال دیا جاسکتا ہے کہ قرآن میں تحریف ہوسکتی ہے؟

پانچویں دلیل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بہت سے کاتب تھے جو وحی کو لکھتے تھے۔ یہ ۴۳ افراد تھے[17] جن میں امیر المؤمنین اور زید ابن ثابت سب سے آگے آگے تھے۔[18]

جس کتاب کے اتنے لکھنے والے ہوں اس تک تحریف کا ہاتھ کیسے پہنچ سکتا ہے؟

چھٹی دلیل

موجودہ قرآن[19] کے سلسلہ میں تمام پیشواؤں کی دعوت اس بات تک پہنچاتی ہے کہ یہ آسمانی کتاب ایک تحریف ناپذیر مجموعہ کی صورت میں تمام زمانوں منجملہ صدر اسلام میں رہا ہے۔

نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا قول اس بات پر شاہد ہے۔ ۱۳۳ویں خطبہ میں ہے کہ: اللہ کی کتاب آپ لوگوں کے درمیان ہے، ایسی متکلم ہے جس کی زبان کبھی کند نہیں پڑتی، ایسا گھر ہے جس کے ستون کبھی منہدم نہیں ہوسکتے، ایسی عزت بخش ہے کہ اس کے دوست کبھی مغلوب نہیں ہوسکتے۔[20]

۱۷۶ویں خطبہ میں فرماتے ہیں: جان لو کہ یہ قرآن ایسا ناصح ہے کہ جو اپنی نصیحتوں میں کبھی ملاوٹ اور خیانت نہیں کرتا، ایسا ہادی ہے جو اپنی ہدایت میں کبھی گمراہ نہیں کرتا۔[21] اسی خطبہ میں ہے کہ: کوئی بھی اس قرآن کا ہم نشیں نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کے پاس سے اضافہ یا کمی کے ساتھ اٹھتا ہے، ہدایت کا اضافہ یا گمراہی کی کمی۔[22] ایسی تعبیریں حضرت علی علیہ السلام اور دیگر پیشوایان دین کی گفتگو میں بہت زیادہ ہیں۔

اگر ہم فرض کرلیں کہ دست تحریف قرآن کی طرف بڑھا ہے تو کیا ممکن تھا اس طرح اس کی طرف دعوت دی جاتی؟ اور راہ و روش اور حق و باطل کی جدائی کے وسیلہ، خاموش نہ ہونے والا نور اور نہ بجھنے والا چراغ نیز اللہ کی مضبوط رسی اور امین و اطمینان بخش سبب نہ کہا جاتا۔[23]

مذکورہ ٦ دلائل کی بنیاد پر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ جاتا کہ قرآن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے اب تک تحریف وتغییر سے پاک اور مبرا رہا ہے۔

حواشی

[1] دیکھئے: پیام قرآن، مکارم شیرازی

[2] دیکھئے: تفسیر المیزان، طباطبائی، ج ١٢، ص ١٥٠، ١٥٥، ١٥٧

[3] اسراء۔٨٨

[4] نساء۔٨٦

[5] مزید معلومات کے لئے: مبانی کلامی اجتہاد، ہادوی تہرانی، مہدی، ص ٥٤ و ٥٥

[6] دیکھئے: ترجمہ المیزان، ج ١٢، ص ١٥٠، ١٥٤

[7] مبانی کلامی اجتہاد، ہادوی تہرانی، ص ٦٧

[8] ایضا

[9] ایضا

[10] تفسیر نمونہ، ج ١١، ص ٢٢

[11] البتہ قرآن کی جمع آوری کے سلسلہ میں متعدد نظریات ہیں۔ اس سلسلہ میں رجوع کیجے: اشاریہ: جمع قرآن، سوال ١٧

[12] منتخب کنز العمال، البیان فی تفسیر القرآن کے نقل کے مطابق، ص ٢٦٠

[13] سفینۃ البحار، ج ١، ص ٥٧

[14] اس سلسلہ میں کمسن حافظ محمد حسین طباطبائی کی واقعات و یادیں پڑھنے چاہئیں یہ حافظ بچپن میں ہی

حافظ ہو اور اس نے بچپنے میں ہی ڈاکٹریٹ حاصل کی۔

[15] تفسیر نمونہ ج ۱۱، ص ۲۴، البتہ یہ اعداد و شمار گزشتہ سال کے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس وقت اس سے کہیں زیادہ ملک میں حافظ موجود ہیں۔

[16] ایضا، فرید وجدی کی دائرۃ المعارف کے مطابق

[17] مؤرخین نے اس تعداد کی چودہ سے ۴۳ تک نقل کی ہے

[18] زنجانی، ابوعبداللہ، تاریخ القرآن، ص ۲۴

[19] یعنی بزرگان اسلام کے اقوال کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے آغاز ہی سے سب کے سب یک زبان ہو کر اسی موجدہ وقرآن کی تلاوت، تحقیق اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتے تھے

[20] و کتاب اللہ بین اظہر کم ناطق لا یعئی لسانہ و بیت لا تہدم ارکانہ و عز لا تہزم اعوانہ

[21] اعلموا ان ھذا القرآن ھو الناصح الذی لا یغش و الھادی الذی لا یضل

[22] و ما جالس ھذا القرآن احد الا قام عنہ بزیادۃ او نقصان زیادۃ فی ھدی و نقصان فی عمی

[23] دیکھئے: تفسیر نمونہ، ج ۱۱، ص ۲۴ تا ۲۶

کیا اسلام کی نظر میں تعظیم کا سجدہ جائز ہے؟

جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے لئے سجدہ کیا، کیا شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مکتب اہل بیت ؑ کے مطابق اس طرح سجدہ تعظیم کی اجازت دی گئی ہے؟

مختصر جواب

اسلام اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کے مطابق عبادت کی مکمل ترین اور زیبا ترین صورت سجدہ ہے جو صرف خداوند متعال سے مخصوص ہے اور خداوند متعال کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔

لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے جو سجدہ کیا گیا، وہ ان پر سجدہ نہیں تھا، بلکہ یہ حقیقت میں خداوند متعال کی عبادت تھی ۔ چونکہ ہم کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں اور اسی طرف سجدہ کرتے ہیں، لیکن کبھی ہمارا یہ سجدہ اور نماز خانہ کعبہ کے لئے نہیں ہوتے ہیں، بلکہ خانہ کعبہ صرف ایک نشانی ہے جس کی طرف توجہ کر کے ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں ۔

تفصیلی جواب

اسلام اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کے مطابق توحید، بلند ترین اور قابل قدر ترین اصول اور کفر و ایمان کے درمیان سرحد ہے۔ توحید کے مقابل میں، خدا کو شریک ٹھہرانا ہے کہ قرآن مجید نے اسے عظیم ظلم [1] اور نا قابل عفو گناہ [2] بیان کیا ہے۔

توحید کی حسب ذیل چار بنیادی شاخیں ہیں:

۱۔ذات میں توحید

۲۔صفات میں توحید

۳۔افعال میں توحید

٤۔عبادت میں توحید

عبادت میں توحید، یعنی صرف خدا کی پرستش کی جانی چاہئے اور اس کے علاوہ کوئی عبودیت کی شائستگی نہیں رکھتا ہے، کیونکہ عبادت اس کے لئے ہونی چاہئے جو کمال مطلق اور مطلق کمال ہے۔جو عام لوگوں سے بے نیاز ہے اور تمام نعمتیں عطا کرنے والا اور تمام مخلوقات کو پیدا کرنے والا ہے اور یہ سب صفتیں خداوند متعال کی پاک ذات کے علاوہ کسی میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

عبادت کا اصلی مقصد، کمال مطلق اور لامحدود ہستی کا قرب حاصل کرنا اور دل وجان میں صفات کمال و جمال کی کرنوں کا انعکاس ہے، جس کا نتیجہ نفسانی خواہشات سے دوری اختیار کرنا اورخودسازی وتہذیب نفس کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ یہ مقصد اللہ یعنی کمال مطلق، کی عبادت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا ہے[3]۔

عبادت کے وسیع معنی ہیں۔لغت کے مطابق عبد، اس انسان کو کہتے ہیں جو سرتا پا اپنے مولا اور مالک سے متعلق ہو، اس کا ارادہ خدا کے ارادہ کے تابع اور اس کی چاہت خدا کی چاہت ہو۔ اپنے مالک کے سامنے اس کی ذات کوئی چیز نہیں ہے اور وہ اس کی اطاعت میں ہرگز سستی اور کاہلی کا مظاہرہ نہیں کرتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں، عبودیت اپنے معبود کے حضور خضوع وخشوع کے آخری درجہ کا اظہار کرنا ہے، اسی لئے صرف وہ معبود ہوسکتا ہے جس نے انتہائی درجہ کے انعام واکرام عطا کئے ہوں اور وہ خداوند متعال کی ذات گرامی کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا ہے۔

اس بنا پر، عبودیت، ایک انسان کے تکامل اور خداوند متعال سے اس کے قرب کی انتہا اور اس کی پاک ذات کے حضور مکمل طور پر تسلیم ہونا ہے[4]۔

قرآن مجید میں عبادت، انسان اور تمام مخلوقات کی تخلیق کا بنیادی سبب شمار کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید کا ارشاد ہے: اور میں نے جنّات اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے[5]۔

اسی وجہ سے عبادت، خداوند متعال کی ذات سے مخصوص ہے اور اس نے اپنی مخلوقات میں سے کسی ایک کو یہ اجازت نہیں دی ہے کہ وہ کسی دوسرے کی پرستش کرے، کیونکہ غیر خدا کی پرستش و عبادت شرک کی سب سے بڑی مثال ہے اور شرک ایک بڑا ظلم اور نا قابل بخشش گناہ ہے۔

عبادت کی ایک مکمل اور سب سے زیبا صورت، سجدہ ہے[6]، کیونکہ سجدہ بندے کا اپنے معبود کے حضور انتہائی خصوع وخشوع کا اظہار ہے۔

اسلام کی نظر میں خداوند متعال کے لئے سجدہ اہم ترین عبادت یا اہم ترین عبادات میں سے ایک عبادت ہے۔ جیسا کہ روایتوں میں آیا ہے کہ، انسان سجدہ کی حالت میں، دوسری تمام حالتوں کی بہ نسبت خدا کے نزدیک تر ہوتا ہے۔ عظیم پیشوا خاص کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت اطہار علیہم السلام طولانی سجدے بجالاتے تھے[7]۔

اسی لئے اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق خدا کے علاوہ کسی اور کے لئے سجدہ کرنا جائز نہیں ہے اور ہماری حدیث کی کتابوں میں عدم جواز السجو دلغیر اللہ کے عنوان سے ایک باب درج کیا گیا ہے اور اس باب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی طرف سے، کئی ایسی روائیتیں نقل کی گئی ہیں جن کے مطابق خدا کے علاوہ کسی اور کے لئے سجدہ کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے[8]۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے سجدہ کرنا۔

قرآن مجید میں غیر خدا کے لئے کئے گئے دو سجدوں کا ذکر آیا ہے۔ ایک ملائکہ کا حضرت آدم علیہ السلام [9] کے لئے سجدہ کرنا اور دوسرا حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں اور ان کے والدین کا حضرت یوسف کے لئے سجدہ کرنا ہے۔ چونکہ یہ دونوں سجدے ایک ہی قسم کے ہیں، اس لئے ہم یہاں پر حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے سجدہ کرنے کے اعتراض کا جواب دیں گے اور حضرت آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کا حکم بھی خود بخود واضح ہو جائے گا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے: اور انہوں نے والدین کو بلند مقام پر تخت پر جگہ دی اور سب لوگ یوسفؑ کے سامنے سجدہ میں گر پڑے اور یوسفؑ نے کہا کہ بابا! یہ میرے پہلے خواب کی تعبیر ہے [10]۔۔۔

اس سلسلہ میں چند احتمالات بیان کئے گئے ہیں:

۱۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ: سجدوں کی دو قسمیں ہیں، ایک سجدہ عبودیت و پرستش ہے، جو صرف خداوند متعال سے مخصوص ہے، اس کے مقابل میں سورج، بتوں اور ستاروں وغیرہ پر سجدہ کرنا ہے کہ مشرکین ایسا سجدہ انجام دیتے تھے اور دوسرا تعظیم و احترام کا سجدہ ہے جو بادشاہوں، سلاطین، انبیائے کرام اور بزرگوں کے سامنے انجام دیا جاتا ہے اور خداوند متعال کے امر و نہی کے تابع ہوتا ہے۔ شریعت اسلام میں سخت تاکید سے کہا گیا ہے کہ اس قسم کا سجدہ حرام ہے، لیکن شرک نہیں ہے۔ خداوند متعال نے اس قسم کے سجدہ کو حضرت آدم علیہ السلام کے لئے واجب قرار دیا ہے اور یہ بالکل خدا کی اطاعت ہے، اس لئے شیطان کو اس کی مخالفت کی وجہ سے نکال باہر کیا گیا، لیکن اس قسم کا سجدہ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام اور انبیائے بنی اسرائیلؑ میں جائز بلکہ قابل ستائش تھا۔ اس کا گواہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ کلام مبارک ہے کہ: اگر خدا کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ کرنا جائز ہوتا، تو میں کہتا کہ بیویاں اپنے

شوہروں کے لئے سجدہ کریں ۔ اس جملہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بیویاں اپنے شوہروں کی پرستش کریں بلکہ اس طرح (سجدہ کر کے) اپنے شوہروں کی تعظیم واحترام کریں [11]۔

۲۔آیہ شریفہ کا مراد یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم سے ان (کے والدین اور بھائیوں) کا کافی احترام کیا گیا اور انہیں خاص محل میں تخت سلطنت پر بٹھایا گیا۔، جب حضرت یوسف علیہ السلام داخل ہو گئے، ان کے دلکش چہرے سے نور الٰہی کی کرنیں چکاچوند لگاتی تھیں، انہوں نے جب یہ حالت دیکھی تو آپے سے باہر ہو کر زمین پر گر پڑے۔

لیکن یہ سجدہ عبادت کے لئے نہیں تھا، اس لئے کہ پرستش اور عبادت کے معنی میں سجدہ صرف خدا وند متعال سے مخصوص ہے اور کسی بھی مذہب میں خدا کے علاوہ کسی اور کی پرستش جائز نہیں ہے ۔عبادت میں توحید، جس کا اہم حصہ مسئلہ توحید سے مربوط ہے، جس کی تمام پیغمبروں نے دعوت کی ہے، اس کا مفہوم بھی یہی ہے۔

اس لئے، نہ خدا کے پیغمبر حضرت یوسف علیہ السلام اس کی اجازت دیتے کہ اس کے لئے سجدہ اور عبادت کریں اور نہ حضرت یعقوب علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر ایسا کام انجام دیتے اور نہ قرآن مجید اسے ایک شائستہ عمل کے طور پر جائز قرار دیتا۔

اس لئے، مذکورہ سجدہ خداوند متعال کے شکرانہ کا سجدہ تھا، وہی خدا جس نے یہ سب لطف ومحبت وعنایت حضرت یوسف علیہ السلام پر کی تھی اور ایسا عظمت والا مقام انہیں عطا کیا تھا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے خاندان کی مشکلات کو دور کیا تھا۔ اس صورت میں یہ سجدہ، خدا وند متعال کے لئے ہونے کے علاوہ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت کے لئے انجام پایا ہے، ان کے لئے تجلیل واحترام بھی شمار ہوتا ہے اور اس لحاظ سے لہ کی ضمیر جو قطعاً حضرت یوسفؑ کی طرف پلٹتی ہے، اس معنی کے ساتھ اچھی طرح سازگار ہے۔

صاحب تفسیر نمونہ کہتے ہیں: یہ معنی قریب تر لگتا ہے، خاص کر اس لئے کہ معصومین

علیہم السلام سے نقل کی گئی متعدد روایتوں میں ملتا ہے کہ: ان کا سجدہ پروردگار عالم کے لئے عبادت کے عنوان سے تھا۔

بعض دوسری احادیث میں ملتا ہے کہ: یوسفؑ کے بھائیوں کا سجدہ پروردگار عالم کی اطاعت کے عنوان سے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے تعظیم اور احترام کے طور پر تھا۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کی داستان میں بھی سجدہ خداوند متعال کے لئے تھا کہ اس نے اس قسم کی غیر معمولی مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ یہ سجدہ عین خدا کی عبادت کے لئے ہونے کے علاوہ، حضرت آدم علیہ السلام کے مقام کے احترام و عظمت کی دلیل بھی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص ایک بہت ہی اہم اور شائستہ کارنامہ انجام دیتا ہے اور ہم اس لئے کہ خداوند متعال نے اس قسم کے بندہ کو پیدا کیا ہے، سجدہ کریں کہ یہ سجدہ خداوند متعال کے لئے بھی ہے اور اس شخص کے احترام کے لئے بھی [12]۔

۳۔ سجدہ کے وسیع معنی کے پیش نظر اس کا مراد، خضوع و تواضع ہے، کیونکہ سجدہ ہمیشہ اس کے معروف معنی میں استعمال نہیں ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات ہر قسم کے تواضع کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس زمانہ میں تعظیم اور احترام کا رسم سر جھکانا تھا اور آیہ شریفہ میں بھی سجدہ کا مراد یہی ہے۔ لیکن جملہ خروا کے پیش نظر، جس کا مفہوم زمین پر گرنا ہے، ایسا لگتا ہے کہ ان کا سجدہ سر جھکانے کے معنی میں نہیں تھا [13]۔

٤۔ بعض دوسرے بڑے مفسرین نے کہا ہے کہ: عبادت کے معنی یہ ہیں کہ بندہ خود کو عبودیت کے مقام پر قرار دے اور عملی طور پر اپنی بندگی اور عبادت کو ثابت بھی کرے اور ہمیشہ بندگی کی حالت میں رہے۔

اس لئے عبادی کام ایسا کام ہونا چاہئے، جس میں مولا کی مولویت اور عبد کی عبدیت کی صلاحیت موجود ہو۔ جیسے سجدہ اور رکوع کرنا یا مولا کے لئے کھڑا ہونا یا اس کے

پیچھے پیچھے چلنا وغیرہ، جس قدر یہ صلاحیت زیادہ ہو، عبادت زیادہ اور عبودیت متعین تر ہوتی ہے۔ مولا کی عزت اور عبودیت کی ذلت کی سب سے واضح تر دلالت، سجدہ کی دلالت ہے، کیونکہ سجدہ میں بندہ زمین پر گرتا ہے اور اپنے چہرے کو خاک پر رکھتا ہے، لیکن سجدہ، ذاتی طور پر عبادت نہیں ہے، بلکہ اس میں عبادت کی نیت کرنا ضروری ہے۔ اس لئے اگر سجدہ میں کسی رکاوٹ کا احساس کیا جائے، وہ حتماً شرعی یا عقلی نہی کی وجہ سے ہوگا اور جو کچھ شرع و عقل میں ممنوع ہے، وہ یہ ہے کہ انسان غیر خدا کے لئے اپنے سجدے سے غیر خدا کے لئے ربوبیت کو ثابت کرے۔ لیکن اگر اس کے سجدہ کا مراد صرف اس کا احترام و تعظیم ہو، اور اس کی ربوبیت کا قائل نہ ہو، بلکہ اس کا مراد ایک قسم کا تکلف اور احترام انجام دینا ہو، تو اس صورت میں اس قسم کے سجدہ کے حرام ہونے کے لئے نہ کوئی شرعی دلیل موجود ہے اور نہ عقلی دلیل۔

جو چیز ہے وہ دینی ذوق ہے، کہ متدین لوگوں نے اسے ذہن کے انس سے دینی ظواہر میں کسب کیا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ کلی طور پر اس عمل کو خداوند متعال سے مخصوص کیا جائے اور غیر خدا کے لئے، حتی تکلف و احترام کے طور پر بھی سر بہ سجود نہ ہو جائیں۔ یہ ذوق قابل انکار نہیں ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ خدا کے بارے میں اظہار اخلاص کے سلسلہ میں انجام پانے والا ہر کام، غیر خدا کے لئے انجام دینا ممنوع ہو[14]۔

حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف کے بھائیوں اور والدہ کا حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے سجدہ کرنا حقیقت میں خدا وند متعال کے لئے سجدہ تھا، لیکن حضرت یوسف کعبہ کے مانند قبلہ تھے، اس لئے بعض اوقات عرب یہ تعبیر استعمال کرتے ہیں: فلاں شخص نے قبلہ کی طرف نماز پڑھی۔

جس طرح ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں اور کعبہ کو اپنا قبلہ جانتے ہیں اور نماز و

عبادت کو اسی طرف انجام دیتے ہیں، اس لئے کعبہ کے سامنے سجدہ کرنے سے خدا کی عبادت کی جاتی ہے نہ کعبہ کی اور معلوم ہے کہ خدا کی آیت چونکہ آیہ و نشانی ہے، خود مستقل نہیں ہے اور اگر اس کے لئے سجدہ کیا جائے، تو صاحب آیت، یعنی خداوند متعال کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کی گئی ہے [15]۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں خدا کے لئے بیان کئے گئے سجدہ کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ کرنا جائز نہیں ہے، اگر چہ وہ تعظیم و احترام کے لئے بھی ہو۔

جیسا کہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بعض اصحاب نے درخواست کی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے سجدہ کریں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: لا بل اسجدوا لله [16] نہیں، بلکہ صرف خدا کے لئے سجدہ کرنا۔

ذیل میں ہم اس موضوع کے بارے میں مراجع عظام کے فتووں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہیں:

دفتر حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای (مدظلہ العالی)

غیر خدا کو سجدہ کرنا حرام ہے اور بعض لوگ جو ائمہ اطہار علیہم السلام کی قبر کے سامنے جو اپنی پیشانی کو زمین پر رکھتے ہیں، اگر خدا کا شکر بجا لانے کے لئے ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، ورنہ حرام ہے۔

دفتر حضرت آیت اللہ العظمیٰ فاضل لنکرانیؒ:

غیر خدا کے لئے تعظیم اور سجدہ جائز نہیں ہے اور حضرت یعقوبؑ اور ان کے فرزندوں کا سجدہ، خداوند متعال کے لئے شکرانے کا سجدہ تھا۔ اس سلسلہ میں مرحوم سید یزدی کے عروۃ الوثقی کی طرف رجوع کریں۔

دفتر حضرت آیت اللہ العظمیٰ سیستانی (مدظلہ العالی)

علماء اور مفسرین کے درمیان یہ معروف ہے کہ، انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خدا کی طرف سے عطا کی گئ عظمت کے پیش نظر خدا کے لئے سجدہ کیا ہے کہ یہ ایک قسم کا سجدہ شکر ہے۔

حواشی

[1]۔لقمان،١٣، وَإِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۣ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿١٣﴾

[2]۔سورہ نساء، ٤٨، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ

[3]۔تفسیر نمونہ، ج٢٧،ص٤٤٧۔

[4]۔تفسیر نمونہ ءج٢٢،ص٣٨٧۔

[5]۔سورہ ذاریات، ٥٦، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾

[6]۔اگر چہ ہر سجدہ عبادت نہیں ہے، یعنی اس طرح نہیں ہے کہ سجدہ عبادت ذاتی ہو اور عبادت کے علاوہ اس پر کوئی اور عنوان مطابقت نہ کرتا ہو۔ ملاحظہ ہو: ترجمہ فارسی، المیز ان، ج١،ص١٩٠۔

[7]۔مکارم شیرازی، شعبہ جواب دیتا ہے، طبع سوم، ١٣٨٥ش، ص١٤٣۔

[8]۔وسائل الشیعہ، موسسہ آل البیتؑ، قم، ١٤٠٩ ہجری قمری، ج٦،ص٣٨٥۔

[9]۔ملاحظہ ہو: نجمی، ہاشم زادہ ہریسی، بیان در مسائل قرآن، ص٦٢٠۔

[10]۔سورہ یوسف، ١٠٠، ورفع ابویہ علی العرش وخروا لہ سجداً وقال یا ابت ہذا تاویل رءیای

[11]۔طیب، سید عبدالحسین، اطیب البیان فی تعسیر القرآن، ج٧،ص٢٨٠۔

[12]۔تفسیر نمونہ، ج١٠،ص٨٢۔

[13]۔تفسیر نمونہ، ج١٠،ص٨٢۔

[14]۔ترجمہ فارسی، المیز ان، ج١،ص١٨٩و١٩٠۔

[15]۔تفسیر المیز ان وتفسیر فخر رازی آیہ مورد بحث کے ذیل میں ترجمہ فارسی المیز ان، ج١١،ص٣٣٩۔

[16]۔مستدرک الوسائل، مؤسسہ آل البیتؑ، قم ١٤٠٨ ہجری قمری، ج٤،ص٤٨٠۔

شیطان اور نفس امارہ کے درمیان کیا فرق ہے؟

مختصر جواب

انسان کی حقیقی ہویت، جسے نفس کہا جاتا ہے، کے متعدد ابعاد اور مراتب ہیں کہ قرآن مجید میں اس کے تین مراتب (امارہ، لوامہ، اور مطمئنہ) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نفس امارہ، اس معنی میں ہے کہ انسان کی حیوانی خواہشات اس کے وجود پر حاکم ہو جائیں اور یہ نفس کی ایک حالت ہے جو انسان کو ہمیشہ اس کے شہوانی خواہشات کو پورا کرنے کا فرمان دیتی ہے۔

لیکن شیطان، لغت و اصطلاح میں ہر بغاوت بر پا کرنے والی اور سرکش مخلوق کو شیطان کہا جاتا ہے خواہ وہ انسان ہو یا جنات یا حیوانات میں سے ہو۔

ابلیس کا مراد، ایک خاص شیطان ہے، جو جنات میں سے ہے اور کثرت عبادت کی وجہ سے فرشتوں کی فہرست میں قرار پایا تھا لیکن آدم کے لئے سجدہ کرنے کے سلسلہ میں خداوند متعال کے حکم کی نافرمانی کرنے کے بعد، رحمت الٰہی کے دربار سے نکال باہر کیا گیا اور اس نے قسم کھائی ہے کہ انسانوں کو وسوسہ کے ذریعہ گمراہی و ضلالت سے دو چار کرے گا۔

نتیجہ یہ کہ نفس امارہ، حقیقت میں شیطان کے ہتھیاروں میں سے ایک ہتھیار اور انسان میں اس کے نفوذ کرنے کا ایک طریقہ ہے، یہ جنات اور شیطان کے سپاہیوں میں شمار ہوتا ہے۔

لہٰذا ابلیس کی طرف سے وسوسہ، ظاہری شیطان کے عنوان سے اور نفس کے ذریعہ خواہشات کو ابھارنا باطنی شیطان کے عنوان سے انسان کو زوال سے دوچار کرتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں نفس امارہ، انسان کے اندر موجود حیوانی رجحان اور مواقع کے۔ پیش نظر شیطانی وسوسہ سے دوچار ہوتا ہے اور شیطان بھی رفتہ رفتہ آگے بڑھتا ہے، یہاں تک کہ انسان بھی حزب شیطان کا جزو بن جاتا ہے۔

تفصیلی جواب

اس سوال کے جواب کے لئے چند مقدمات کی ضرورت ہے:

پہلا مقدمہ: نفس اور اس کے مراتب۔

انسان کی حقیقی ہویت کے حیوانی، انسانی، الٰہی تین ابعاد اور مراتب ہیں۔ قرآن مجید کی آیات سے بھی بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ انسانی روح اور نفس کے تین مراحل اور مراتب ہیں[1]:

۱۔ نفس امارہ یا انسان کا حیوانی مرتبہ

انسان کا حیوانی مرتبہ شہوت، غضب اور نفسانی خواہشات پر مشتمل ہوتا ہے[2]۔ اس قلبی رجحان اور نفسانی حالت کو قرآن مجید نے نفس امارہ کا نام دیا ہے اور اس سلسلہ میں تاکید فرماتا ہے: اور میں اپنے نفس کو بری نہیں قرار دیتا کہ نفس بہرحال برائیوں کا حکم دینے والا ہے[3]۔

اسی وجہ سے اسے امارہ (یعنی برائیوں کا حکم کرنے والا) کہا گیا ہے۔ اس مرحلہ میں ابھی عقل و ایمان اس حد میں نہیں ہیں کہ سرکش اور باغی نفس پر قابو پا کر اسے رام کرسکیں بلکہ بہت سے مواقع پر عقل و ایمان ہتھیار ڈالتے ہیں اور نفس انہیں شکست دیتا ہے۔

عزیز مصر[4] کی بیوی کے کلام میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، جب اس نے

کہا:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ [5] میں اپنے نفس کو بری نہیں قرار دیتی کہ نفس بہرحال برائیوں کا حکم دینے والا ہے۔

۲۔ نفس لوّامہ:

نفس لوامہ نفس کا ایک ایسا مرحلہ ہے کہ انسان، تعلیم و تربیت اور جدو جہد کے بعد اس مرحلہ پر فائز ہوتا ہے، کبھی کبھی جبلتوں کی بغاوتوں کے نتیجہ میں بعض خلاف ورزیوں کا بھی مرتکب ہوتا ہے، لیکن فوراً پشیمان ہو کر اپنے آپ کی سرزنش و ملامت کرتا ہے اور اپنے گناہ کی تلافی کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اور اپنے دل و جان کو توبہ کے پانی سے دھو لیتا ہے۔

قرآن مجید نفس کے اس مرحلہ کو نفس لوامہ کہتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: اور برائیوں پر ملامت کرنے والے نفس (نفس لوامہ) کی قسم کھاتا ہوں کہ قیامت حق ہے [6]

۳۔ نفس مطمئنہ:

نفس مطمئنہ نفس کا وہ مرحلہ ہے، کہ انسان مکمل تصفیہ، تہذیب اور تربیت کے بعد اس مرحلہ پر فائز ہوتا ہے، اس مرحلہ پر انسان کی سرکش جبلتیں عقل و ایمان سے جنگ کرنے کی توانائی نہیں رکھتی ہیں، کیونکہ اس مرحلہ میں عقل و ایمان اس قدر قوی ہوتے ہیں کہ ان کے مقابل میں نفسانی خواہشات کوئی خاص طاقت نہیں رکھتی ہیں۔

یہ انبیاء، اولیاء اور ان کے حقیقی پیروکاروں کا مقام ہے، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مردان خدا کے مکتب میں ایمان و تقوی کا درس حاصل کیا ہے اور برسوں تک تہذیب نفس کر کے، جہاد اکبر کو انتہائی مرحلہ تک پہنچایا ہے۔

قرآن مجید اس مرحلہ کو نفس مطمئنہ کہتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف پلٹ آ، اس عالم میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی

ہے[7]۔

دوسرا مقدمہ: ابلیس اور شیطان

۱۔ ابلیس:

ابلیس کا مراد ایک خاص شیطان ہے جو جنّات میں سے ہے۔ یہ شیطان، یعنی ابلیس کثرت عبادت کی وجہ سے ملائکہ کے درجہ پر پہنچ چکا تھا، لیکن نافرمانی اور بغاوت کے بعد اس مقدس مقام سے گر گیا۔ چونکہ اس نے خدا کے حکم کی اطاعت نہیں کی اس لئے زوال سے دوچار ہو گیا[8]۔

۲۔ شیطان:

لفظ شیطان، مادہ شطن سے ہے اور اس کے معنی مخالفت اور دوری ہے، اور ہر باغی و سرکش مخلوق کو شیطان کہا جاتا ہے، خواہ وہ انسانوں میں سے ہو یا جنات و حیوانات میں سے[9]۔

چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے: اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے جنات و انسان کے شیاطین کو ان کا دشمن قرار دے دیا ہے[10]۔۔۔

ابلیس، چونکہ ایک نافرمان، سرکش اور تخریب کار مخلوق ہے اس لئے اسے شیطان کہا جاتا ہے۔

تیسرا مقدمہ: شیطان کے ساتھ نفس امارہ کا رابطہ

نفس امارہ، حقیقت میں شیطان کے وسائل اور انسان میں نفوذ کرنے والی راہوں میں سے ایک راہ ہے اور نفس امارہ، شیطان کے سپاہیوں میں شمار ہوتا ہے۔

پس ابلیس کی طرف سے وسواس، ظاہری شیطان کے عنوان سے، اور نفس امارہ کی خواہش باطنی شیطان کے عنوان سے، انسان کو زوال سے دوچار کرتے ہیں۔

شیطان کی تمام کوششیں یہ ہوتی ہیں کہ انسان گمراہ ہو کر حقیقت تک نہ پہنچ جائے اور اسی سلسلہ میں اس نے خدا وند متعال کی عزت کی قسم کھائی ہے ۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: اس نے کہا: تو پھر تیری عزت کی قسم میں سب کو گمراہ کروں گا، علاوہ تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے خالص بنالیا ہے[11]۔

اغوای لفظ غی سے ہے اور اس کے معنی رشد و بالیدگی کی ضد ہے، اور رشد و بالیدگی حقیقت تک پہنچنے کے معنی میں ہے [12]۔

شیطان نے خداوند متعال کی عزت کی قسم کھائی ہے کہ انسان کو گمراہ کردے گا [13]۔ وہ انسان کو گمراہ کرنے کے لئے قدم بہ قدم آگے بڑھتا ہے اور انسان کو اپنے وسوسوں کے تحت قرار دیتا ہے، یہاں تک کہ انسان خود شیطان بن جاتا ہے اور اس کے ذریعہ دوسرے انسان بھی گمراہ کئے جاتے ہیں ۔

جو انسان، شیطانی وسوسوں کے نتیجہ میں نفسانی اور حیوانی خواہشات کے سامنے ہتھیار ڈالتا ہے وہ نفس امارہ کے دام میں پھنس جاتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: نفس امارہ منافق کے مانند انسان کے ساتھ چاپلوسی کرتا ہے اور دوست کے روپ میں پیش آتا ہے تا کہ انسان پر مسلط ہو جائے اور اسے بعد والے مراحل میں داخل کرے[14]۔

شیطان، ضعیف الایمان انسانوں کو واسواس میں گرفتار کر کے، ان کے نفسانی خواہشات اور شہوانی رجحانات اور نفس امارہ کی مدد کر کے ان کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور سر انجام اس کے بدن کے نزدیک آکر اس کے ساتھ ہاتھ ملاتا ہے اور اس کا دوست اور رفیق بن جاتا ہے۔ جس شخص کا دل شیطان کا گھر بن جاتا ہے، تو وہ صرف شیطان کا میز بان ہی نہیں بلکہ اس کا دوست بھی بن جاتا ہے[15]۔

اس گروہ کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: پس شیطان ان کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ان کی زبانوں سے بولتا ہے[16]۔

نتیجہ: شیطان اور نفس امارہ، دونوں انسان کے دشمن ہیں، اسی لئے قرآن مجید نے بھی شیطان کو انسان کے کھلم کھلا دشمن کے عنوان سے معرفی کیا ہے اور انسان کو تاکید کرتا ہے کہ اسے اپنا دشمن جان لے[17]۔

اس کے علاوہ معصومین علیہم السلام کی ایک روایت میں نفس امارہ (نفسانی خواہشات) کو انسان کا دشمن شمار کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے[18]۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس بیان میں نفس کے اس مرحلہ کی طرف اشارہ ہے۔

نفس کا سب سے بڑا دشمن ہونے کا راز اس کا باطنی ہونا ہے۔ ظاہری دشمن اور چور، اس باطنی دشمن اور چور کی مدد کے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے۔ یہ باطنی دشمن اس کا محرم اسرار رہے اور ہر جگہ کے بارے میں آگاہ ہے اور اس آگاہی سے استفادہ کر کے انسان کی خواہشات کی رپورٹ شیطان کو پہنچاتا ہے۔

دوسری جانب سے نفس امارہ، ابلیس کے پیغام اور فرمان کو، جو ظاہری برائیوں پر مشتمل ہوتا ہے، پہنچاتا ہے۔ اس لحاظ سے نفس امارہ خود بھی شیطان کا سپاہی شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے بہت سے اوصاف، شیطانی سپاہی میں شمار ہوتے ہیں[19]۔ پس انسان میں موجود حیوانی رجحانات کے پیش نظر نفس امارہ شیطانی وسوسوں کے تحت قرار پاتا ہے اور مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھتا ہے، یہاں تک انسان بھی شیطان کی پارٹی کا رکن بن جاتا ہے[20]۔

حواشی

[1]۔تفسیر نمونہ، ج ۲۵،ص ۲۸۱۔

[2]۔حق و تکلیف در اسلام، عبداللہ جوادی آملی، ص ۸۹۔

[3]۔سورہ یوسف، ۵۳۔

[4]۔بعض مفسرین نے اس جملہ کا مراد حضرت یوسف علیہ السلام سمجھا ہے لیکن اس نظریہ کو اکثر مفسرین قبول نہیں کرتے ہیں تفسیر نمونہ، ج ۹، ص ۴۱۳ و ۴۱۴۔

[5]۔سورہ یوسف، ۵۳۔

[6]۔قیامت، ۲ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ؀

[7]۔ سورہ فجر، ۲۷۔۲۸ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ؀ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ؀ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ؀ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ؀

[8]۔ترجمہ فارسی تفسیر المیزان، ج ۸، ص ۲۶۔

[9]۔المنجد فی اللغۃ: تفسیر نمونہ، ج ۱، ص ۱۹۲۔

[10]۔سورہ انعام، ۱۱۲، وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ

[11]۔سورہ ص، ۸۲ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ؀

[12]۔ترجمہ فارسی تفسیر المیزان، ج ۱، ص ۶۳۱۔

[13]۔سورہ ص، ۸۲ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ؀

[14]۔غرر الحکم۔

[15]۔مبادی اخلاق در قرآن عبداللہ جوادی آملی، ص ۱۱۵۔

[16]۔نہج البلاغہ، خطبہ ۷، فنظر باعینهم و نطق بالسنتهم۔

[17]۔سورہ بقرہ، ۱۶۸، انہ لکم عدو مبین وہ آپ کے لئے کھلم کھلا دشمن ہے۔

[18]۔بحار الانوار، ج ۶۷، ص ۶۴۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: اعدی عدوك نفسك التی بين جنبيك

[19]۔تفسیر تسنیم، عبداللہ جوادی آملی، ج ۸، ص ۵۱۶۔

[20]۔مجادلہ، ۱۹، اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ ان پر شیطان غالب آ گیا ہے اور اس نے انہیں ذکر خدا سے غافل کر دیا ہے، آگاہ ہو جاؤ کہ یہ شیطان کا گروہ ہیں۔

خیر وشر کے پیش نظر، دنیا میں برائی اور بھلائی کو کیسے خدا کی مہربانی ثابت کیا جاسکتا ہے؟

خداوند متعال کے مہربان ہونے کو کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟ اس دنیا میں جس قدر خوبی اور خیر ونیکی پائی جاتی ہے اسی قدر شر اور برائی بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً حیوانات میں بھی اچھے اور خوبصورت حیوانات پائے جاتے ہیں اور برے اور درندہ حیوانات بھی پائے جاتے ہیں اس کو کیسے مسترد کیا جاسکتا ہے کہ شاید دو خدا ہوں، ایک خوبیوں کا خدا اور دوسرا برائیوں کا خدا؟

مختصر جواب

خداوند متعال نے انسان کو بہترین حالات میں پیدا کیا ہے اور اس کی اس دنیا اور دوسری دنیا کی تمام ضرورتوں کو پورا کیا ہے۔ بلکہ تمام مخلوقات کو انسان کے لئے پیدا کیا ہے اور انہیں اس کی خدمت میں قرار دیا ہے، یہ سب چیزیں خداوند متعال کی انسان کی بہ نسبت بہترین مہربانی ہے۔ اسی طرح خداوند متعال دوسری تمام مخلوقات کے لئے بھی مہربان ہے۔ کہ اس نے ان کو عدم سے وجود میں لایا ہے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کیا ہے اور انہیں کمال کی طرف ہدایت کی ہے۔

دوسری طرف سے برائیوں میں سے ہر ایک برائی اور عالم ہستی میں موجود ناخوشگوار

حالات، کے بارے میں لگتا ہے کہ ان میں کچھ خاص وجوہات پائے جاتے ہیں اور ان کے بارے میں آگاہی حاصل ہونے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ ان کا خدا کی رحمت اور مہربانی سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

تفصیلی جواب

خداوند متعال کی مہربانی جیسی صفات کی بحث میں اس نکتہ کی طرف توجہ رکھنا ضروری ہے کہ ہر مخلوق کی خصوصیات کو اس مخلوق کی عظمت اور وجودی ابعاد کے پیش نظر تحقیق کی جانی چاہئے۔ مثال کے طور پر ایک طفل شیر خوار کے بارے میں ایک بچے کی مہربانی صرف اسی حد میں ہے کہ وہ اس طفل شیر خوار کو خطرناک چیزوں کے نزدیک جانے نہیں دیتا ہے اور جن کھانے پینے کی چیزوں کو خود پسند کرتا ہے وہی اس کو بھی دیتا ہے۔

لیکن اس کے ماں باپ کی مہربانی کا دائرہ وسیع تر ہوتا ہے۔ یعنی وہ اس کو خطرے سے بھی دور رکھتے ہیں اور اس کے کھانے پینے اور لباس کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتے ہیں، اور اسے خطرناک بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے کبھی اس کی مرضی کے خلاف دردناک ویکسین کے انجکشن لگواتے ہیں جو اس کے لئے تکلیف اور درد کا سبب بنتے ہیں اور ممکن ہے یہ ویکسین بچے کے لئے ایک ہفتہ تک بخار اور تشنج میں مبتلا کر کے بسترے پر لیٹنے کا سبب بنے۔ لیکن اس کے ماں باپ اس کام کو مکمل احتیاط اور توجہ کے ساتھ انجام دیتے ہیں، کیونکہ اس کام کو اپنے فرزند کے حق میں بالکل لطف و مہربانی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کا فرزند اس رنج و تکلیف کو برداشت نہ کرے تو وہ مہلک بیماریوں سے نہیں بچ سکتا ہے اور اس کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ لہٰذا چونکہ آج کی یہ تکلیف اور رنج بیماریوں کے مقابل میں صحت و سلامتی اور مقاومت کا سبب ہے، اس لئے وہ اس کو عین مہربانی جانتے ہیں، اس طرح کہ اگر کوئی ماں باپ اس لئے کہ اس کے فرزند ناراحت نہ ہو جائیں، اس کام کو انجام نہ

دیں تو سب لوگ ان پر نا مہربانی اور سنگدلی کا الزام لگا کر ان کی سرزنش کریں گے۔

اسی طرح اپنے بندوں کی بہ نسبت خدا کی مہربانی، شیر خوار بچے کی بہ نسبت ماں باپ کی مہربانی سے فرق رکھتی ہے اور یہ مہربانی بلند تر سطح پر ہوتی ہے۔ اگر ہم انسانی زندگی کو دنیا تک محدود اور موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھ لیں تو ممکن ہے ہم بعض ناخوشگوار حالات کو بندوں کے حق میں کم لطفی جان لیں، لیکن اگر ہم تمام عالم ہستی کو مدنظر رکھتے ہوئے من جملہ دنیا وآخرت، یعنی انسان کی پیدائش سے پہلے، اس دنیا کی پوری زندگی، موت کے بعد برزخ، قیامت، بہشت اور جہنم، جو مخلوقات کے لئے مدنظر رکھے گئے ہیں، کو مجموعی طور پر انسان کی زندگی سمجھ لیں اور خداوند متعال کی مہربانی کو اسی وسعت میں تحقیق کریں، تو ہم تمام واقعات اور حوادث کو بندوں کی بہ نسبت خداوند متعال کی عین مہربانی سمجھ لیں گے۔

چونکہ ہمیں خلقت میں غور وخوض کرنے کے نتیجہ میں معلوم ہوتا ہے کہ خداوند متعال نے مخلوقات کی تمام ضروریات کو کمال تک پہنچنے کے لئے ان کے تناسب سے فراہم کیا ہے۔ یعنی ہر مخلوق کے رشد وکمال کی حالت کو اس کی حد واندازہ میں فراہم کیا ہے کہ یہ پروردگار عالم کی اس کی مخلوقات کی بہ نسبت محبت کی علامت ہے۔

اس کے علاوہ جس خدا کی طاقت ختم نہ ہونے والی اور اس کا علم لامحدود ہے اور اس کے دوسروں کو خیر کرنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی ہے، کیونکہ نہ کوئی اس سے حسادت کرنے والا ہے اور نہ وہ اپنی طاقت کے نابود ہونے سے ڈرتا ہے اور نہ اس میں جہل اور معلومات کی کمی کا امکان ہے تا کہ یہ چیزیں اس کی بخشش اور مہربانی میں رکاوٹ بن سکیں، ایسے خدا کے بارے میں کیسے قبول کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی مخلوقات کو خیر پہنچانے میں دریغ اور کوتاہی کرے؟ بلکہ اس نے اپنے علم وقدرت اور بے انتہا لطف ومہربانی سے عالم (احسن نظام) کو تخلیق کیا ہے جس میں بیشتر خیر ونیکی حاصل ہوتی ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند

متعال کی مہربانیاں الٰہی حد و عظمت میں ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ جس خدا نے والدین، خاص کر ماں کے دل میں اپنے فرزندوں کے بارے میں مہر و محبت قرار دی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ خود بھی اس مہر و محبت کے بالاتر اور مکمل تر درجہ پر فائز ہو اور محبت سے خالی نہ ہو۔ کیونکہ فلاسفہ کے قول کے مطابق: جو دوسروں کو کمال بخش سکتا ہو، ممکن نہیں ہے کہ وہ خود صاحب کمال نہ ہو [1]۔

لیکن دنیا میں موجود ناخوشگواریاں، ظلم، مشکلات، رنج و مصیبتیں، محرومیتیں اور موت وفوت جیسے حوادث دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

۱۔ وہ حوادث جو انسانوں کے ناپسند طرز عمل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، جیسے: ظلم، قتل، اور غارت وغیرہ۔

۲۔ وہ ناخوشگواریاں جو فطری حوادث کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، جیسے: سیلاب، زلزلے، خشک سالی اور بیماریاں وغیرہ۔

حوادث کی پہلی قسم کے بارے میں قابل ذکر بات ہے کہ، چونکہ خداوند متعال نے انسان کو ایک بااختیار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے تاکہ وہ بھلائی اور برائی، بدصورتی و خوبصورتی اور خیر و شر میں سے ایک کا انتخاب کرے، اس قسم کے نظام کا لازمہ یہ ہے کہ بعض اوقات انسانوں کے توسط سے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے نتیجہ میں معاشرہ میں شر، برائیاں، ظلم اور بے انصافیاں وجود میں آتی ہیں اور واضح ہے کہ یہ ناخوشگوار واقعات خدا کی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی مخلوقات کی طرف سے حاصل ہوئے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی بنا پر فساد خشکی اور تری ہر جگہ غالب آگیا ہے [2]۔ لیکن قیامت اور لوگوں کے اعمال اور حقوق کے دقیق حساب و کتاب کے پیش نظر ان مظالم اور بے انصافیوں کی تلافی ہوگی۔

دوسری قسم کے بارے میں، جو قدرتی حوادث کے نتیجہ میں رونما ہوتے ہیں درج ذیل نکات کو بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ یہ دنیا انسانوں کے لئے امتحان کا ہال اور دقیق حساب و کتاب کی جگہ ہے اور تمام واقعات، من جملہ آسائشیں، سختیاں، شادیاں، مصیبتیں، نعمتوں کی فراوانیاں، اور محرومیتیں وغیرہ برے اور بھلے کے درمیان تشخیص دینے اور امتحان کا وسیلہ ہیں۔ اگر ہم خداوند متعال کی طرف سے اس سلسلہ میں سر بلند افراد کو عطا کی جانے والی نا قابل توصیف پاداش واجر کو مدنظر رکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس دنیا کے تلخ ترین حوادث خداوند متعال کی عین مہربانی اور بے انتہا لطف وکرم ہیں، کیونکہ جس قدر رنج و مصیبتیں زیادہ ہوں، اجر وثواب بھی اسی قدر کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے بہت سے مواقع پر مذکورہ مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے اور ارشاد بارتعالی ہے: اور ہم یقیناً تمہیں تھوڑے خوف تھوڑی بھوک اور اموال، نفوس اور ثمرات کی کمی سے آزمائیں گے اور اے پیغمبر! ان صبر کرنے والوں کو بشارت دیدیں [3]۔

۲۔ مشکلات اور سختیاں، افراد کی تربیت کرنے والی، قوموں کو بیدار کرنے والی اور ان کے عزم وارادہ کو ابھارنے والی ہوتی ہیں [4]۔ اور اسی وجہ سے سختیوں کا وجود خلقت کے مقصد کے بالکل مطابق ہوتا ہے اور انسانوں کو کمال تک پہنچانے والے خداوند متعال کی مہربانی کے منافی نہیں ہے۔

۳۔ بہت سی ناخوشگواریاں انسان کی رشد و پالیدگی میں کلیدی رول ادا کرتی ہیں۔ جن انسانوں نے فقر ومحتاجی میں رشد کیا ہے اور سختیوں اور ناخوشگوار حالات سے مقابلہ کیا ہے انہیں نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں کہ انسانی معاشرے ترقی اور پیشرفت میں ان کے مرہوں منت ہیں۔

٤۔ اگر بدصورتی، خوبصورتی کے ساتھ نہ ہوتی تو نہ خوبصورتی، خوبصورت ہوتی اور نہ بدصورتی، بدصورت ہوتی، اور اگر سب لوگ خوبصورت ہوتے تو خوبصورتی ہی نہ ہوتی اور کوئی خوبصورت نہ ہوتا۔۔۔حقیقت میں خوبصورتوں کی کشش بدصورتوں کے دافعہ سے توانائی حاصل کرتی ہے [5]۔

٥۔ بدصورتیاں، زیبائیوں کا مقدمہ ہیں اور زیبائیوں کو پیدا کرنے والی ہوتی ہیں، یعنی مشکلات اور مصیبتوں کے اندر خوش بختی اور سعادت مضمر ہوتی ہے، اس کے علاوہ کبھی سعادتوں کے اندر بدبختیاں مضمر ہوتی ہیں اور یہ اس دنیا کا فارمولا ہے [6]۔

اگر ہم مجموعی طور پر ان مسائل کو مدنظر رکھیں تو واضح ہوگا کہ جن چیزوں کے بارے میں ہم اس دنیا میں احساس کر رہے ہیں کہ وہ شر ہیں، حقیقت میں وہ بلند ترین نیکیوں تک پہنچنے کی راہ کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

اما، آپ کے سوال کے آخری حصہ، یعنی شر کو پیدا کرنے والے کے بارے میں قابل ذکر بات ہے کہ شر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے پیدا کیا گیا ہو بلکہ یہ ایک عدمی امر ہے جو کسی دوسری چیز کے نابود ہونے کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بدن کے کسی عضو کا ناقص ہونا، پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ یہ انسان کے اعضاء میں کسی عضو کے نہ ہونے یا عدم خلق کا نتیجہ ہے۔ اس طرح شبہ ثنو یہ اور عالم میں دو خداؤں کے ہونے کا توہم ختم ہوتا ہے، کیونکہ ہستی دو قسم کی نہیں ہے تاکہ اس کے دو مبدا ہوں [7]۔ بلکہ ہستی، ہونے کے لحاظ سے خیر ہے اور نیستی و نابودی، نہ ہونے اور وجود نہ رکھنے کے لحاظ سے شر ہے۔ اور یہ ہستی ہے کہ جسے خالق کی ضرورت ہے ورنہ عدم اور نیستی کو تو خالق کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ پس عالم کا صرف ایک ہی خالق ہے۔

حواشی

[1]۔ بدایۃ الحکمۃ علامہ طباطبائی، ص۲٦٩، معطی الکمال غیر فاقد

[2]۔سورہ روم،٤١ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

[3]۔سورہ بقرہ،١٥٥: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ
وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿١٥٥﴾

[4]۔عدال الٰہی شہید مطہری، ص١٥٦۔

[5]۔عدال الٰہی شہی مطہری، ص١٤٣۔

[6]۔عدال الٰہی شہی مطہری، ص١٤٩۔

[7]۔کتاب عدل الٰہی شہید مطہری، ص١٣٥۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کے نام کیوں واضح طور پر قرآن مجید میں ذکر نہیں ہوئے ہیں؟

مختصر جواب

قابل توجہ بات ہے کہ اگر چہ ائمہ اطہار علیہم السلام کے نام قرآن مجید میں واضح طور پر ذکر نہیں ہوئے ہیں، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام مبارک میں ائمہ معصومین علیہم السلام کے اسمائے گرامی واضح طور پر بیان ہوئے ہیں، خاص کر حضرت علی بن ابیطالبؑ کا اسم مبارک، جس کا واضح مصداق حدیث غدیر ہے، جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے باقاعدہ طور پر اعلان کے مترادف ہے۔ حدیث غدیر سند کے لحاظ سے متواتر ہے اور دلالت کے لحاظ سے حضرت امام علی علیہ السلام کی امامت کا واضح گواہ ہے۔

اس کے علاوہ خود قرآن مجید میں حضرت علی علیہ السلام کی شان میں چند آیات نازل ہوئی ہیں کہ ان میں سے سب سے اہم سورہ مائدہ کی آیت ۵۵ ہے کہ فرماتا ہے: ایمان والو! بس تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ صاحبان ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوہ دیتے ہیں۔ اور شیعہ وسنی کی تفسیر، تاریخ اور احادیث کی کتابوں میں آیا ہے کہ یہ آیت امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے نماز میں رکوع کی حالت میں راہ خدا میں انگوٹھی صدقہ دینے کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس کا مصداق حضرت علیؑ بن ابیطالب کے علاوہ کوئی نہیں

ہے۔پس اگر چہ حضرت علی علیہاالسلام کا نام واضح طور پر قرآن مجید میں نہیں آیا ہے، لیکن آپؑ کی طرف واضح اشارے ہوئے ہیں۔

لیکن یہ سوال کہ کیوں حضرت علی علیہ السلام کا نام واضح طور پر قرآن مجید میں نہیں آیا ہے؟اس کے کم از کم دو جواب دیئے جا سکتے ہیں۔اول یہ کہ قرآن مجید اس امر پر مبنی ہے کہ مسائل کو اجمالی صورت میں اور اصل اور قاعدہ کے طور پر بیان کرے، نہ یہ کہ تفصیلات اور مسائل کے جزئیات بیان کرے۔چنانچہ بہت سے مسائل میں قرآن مجید کی روش ایسی ہی رہی ہے۔اسی لئے جب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال ہوتا ہے کہ اماموں کے نام کیوں قرآن مجید میں نہیں آئے ہیں؟ تو آپؑ جواب میں فرماتے ہیں: جس طرح خداوند متعال نے نماز، زکات اور حج کو اصل اور کلی قانون کی صورت میں نازل فرمایا ہے اور ان کی تفصیلات بیان نہیں کی ہیں، بلکہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے انجام دینے کے طریقے اور احکام بیان فرمائے ہیں، اسی طرح ولایت کے بارے میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام اور اپنے اہل بیتؑ کی خلافت کے بارے میں وضاحت فرمائی ہے بغیر اس کے کہ قرآن مجید میں ائمہ علیہم السلام میں سے ہر ایک کا نام ذکر ہوا ہو۔دوسرے یہ کہ: جن مسائل کے سلسلہ میں مخالفت کا احتمال زیادہ ہو، مصلحت یہ ہے کہ قرآن مجید غیر مستقیم اور اشارہ وکنایہ کے ذریعہ مطلب کو بیان کرے، کیونکہ احتمال یہ ہے کہ ائمہ علیہم السلام کی امامت سے مخالفت کا مسئلہ خود قرآن مجید اور دین کی مخالفت پر منتج ہو جائے جو مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف ہے، یعنی ممکن تھا کہ اگر حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے بارے میں قرآن مجید میں کوئی واضح آیت بیان ہوتی تو آپؑ کی ولایت کے مخالفین، آپؑ سے مخالفت کے پیش نظر اس آیت کو تحریف، تبدیل یا حذف کر دیتے تو اس وقت اسلام کی دین خاتم کے عنوان سے قدر ومنزلت اور قرآن مجید کے ایک آسمانی اور لافانی کتاب کے عنوان سے بے احترامی ہوتی۔اس کے علاوہ

قابل توجہ بات ہے کہ اگر خداوند متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے: م نے قرآن مجید کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے محافظ ہیں قرآن مجید کے تحفظ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ مخالفت اور تحریف کے محرکات کو عادی صورت میں ذکر نہ کیا جائے۔ اس لئے قرآن مجید میں اولاً حضرت علیؑ کی ولایت کو واضح طور پر اور آپؑ کا نام لے کر بیان نہیں کیا گیا ہے، ثانیاً: حضرت علی علیہ السلام کی ولایت سے متعلق آیات خاص کر آیہ تبلیغ، جو حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے سلسلہ میں باضابط اعلان ہے اور آیہ تطہیر جو اہل بیت کی عصمت کے بارے میں ہے، ایسی آیات کے بیچ میں بیان ہوئی ہیں، جن کا بظاہر ان آیات (ولایت وتبلیغ) کے موضوع سے کوئی ربط دکھائی نہیں دیتا ہے، تاکہ تحریف وتبدیلی کے محرکات کو حتی الامکان کم کیا جائے اور قرآن مجید پوری تاریخ میں ہر قسم کی مداخلت اور تحریف سے محفوظ رہے.

تفصیلی جواب

ابتدا میں اس نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ اولا: ائمہ معصومین کے اسمائے گرامی کا ذکر پیغمبر اکرمؐ کے کلام میں واضح طور پر آیا ہے، خاص کر حضرت علی علیہ السلام کے اسم مبارک اور آپ کی ولایت اور جانشینی کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی بار صاف صاف وضاحت فرمائی ہے. اس کی ابتدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعثت کے آغاز پر اپنے رشتہ داروں کو ابلاغ رسالت کرتے ہوئے کی اور فرمایا: جو شخص سب سے پہلے مجھ پر ایمان لائے گا، وہ میرا وصی، جانشین اور وزیر ہوگا اور علی علیہ السلام کے علاوہ کسی نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس فرمائش کا مثبت جواب نہیں دیا اور آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ علیہ السلام سے فرمایا: تم میرے بعد میرے وصی، وزیر اور خلیفہ ہو[1] دوسرا موقع حدیث غدیر ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح طور پر فرمایا: **من کنت مولاہ فعلی مولاہ**[2] جس جس کا میں مولا ہوں، اس کے علی بھی مولا ہیں اور اسی طرح حدیث منزلت کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: انت منی بمنزلہ ھارون من موسی الا انہ لانبی بعدی[3].

حضرت علی علیہ السلام کی خلافت وجانشینی کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث اکثرا متواتر ہیں، اور اس مطلب کی طرف اہل سنت اور شیعوں کی بہت سی کتابوں میں اشارہ ہوا ہے[4]. ایک دوسری حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ائمہ معصومین علیہم السلام کے اسمائے گرامی، حضرت علی علیہ السلام سے لے کر حضرت حجت (عج) تک جابر بن عبداللہ انصاری سے بیان فرمائے ہیں[5].

لہٰذا اس مطلب کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ اگر چہ ائمہ اطہار علیہ السلام کے نام قرآن مجید میں واضح طور پر ذکر نہیں ہوئے ہیں، لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے نام واضح طور پر بیان فرمائے ہیں اور ان کی جانشینی اور امامت پر تاکید فرمائی ہے، جبکہ قرآن مجید کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام مکمل طور پر حق اور وحی الٰہی کے مطابق ہے[6].

ثانیا: قرآن مجید میں امیر المومنین علی علیہ السلام کی ولایت کے بارے میں اشارہ ہوا ہے اگر چہ واضح طور پر آپؑ کا نام نہیں آیا ہے. عام مفسرین، خواہ شیعہ ہوں یا سنی، نے اعتراف کیا ہے کہ یہ آیہ شریفہ حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے اور آپ کے علاوہ اس کا کوئی اور مصداق نہیں ہے[7]. اور وہ سورہ مائدہ کی ۵۵ وین آیت ہے کہ جس میں فرمایا ہے: اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۝۵۵ ایمان والو! بس تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول اور صاحبان ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوہ دیتے ہیں.

چونکہ اسلام میں کوئی ایسا حکم اور قانون نہیں ہے کہ انسان رکوع کی حالت میں زکات ادا کرے، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیہ شریفہ ایک ایسے واقعہ کی طرف اشارہ کرتی

ہے جو ایک بار خارج میں رونما ہوا ہے، اور وہ یہ تھا کہ حضرت علی علیہ السلام رکوع کی حالت میں تھے کہ ایک سائل نے آکر مدد کی درخواست کی، حضرتؑ نے اپنی انگلی کی طرف اشارہ فرمایا اور سائل نے آکر انگلی سے انگوٹھی نکال لی اور چلا گیا [8].اسی لئے آیہ شریفہ فرماتی ہے: [9]بس تم مسلمانوں کا ولی اور سرپرست اللہ اور اس کا رسول اور حضرت علی علیہؑ ہیں اور ان کے علاوہ کوئی اور تم پر ولایت نہیں رکھتا ہے.

پس، یہاں تک واضح ہوا کہ پیغمبر اکرم صلی کی زبان پر معصوم کا نام صراحت کے ساتھ جاری ہوا ہے اور قرآن مجید میں بھی امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے بارے میں واضح اشارہ وکنایہ بیان ہوا ہے. اگر ایک انصاف پسند اور حق وحقیقت کا متلاشی محقق، تھوڑی سی تحقیق اور جانچ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کی جانشینی اور امامت کے بارے میں، حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولاد طاہرین کی خلافت تھی. لیکن یہ سوال کہ قرآن مجید میں کیوں واضح طور پر ائمہ اطہار علیہم السلام کے نام ذکر نہیں ہوئے ہیں؟ اس کی دو دلیلیں ہوسکتی ہیں:

۱.قرآن مجید اس امر پر مبنی ہے کہ مسائل کو اجمالی صورت میں اور اصول وقاعدہ کی شکل میں بیان کرے نہ یہ کہ ان کی تفصیل اور جزئیات کی تشریح کرے، چنانچہ بہت سے اصول اور فروع کے بارے میں قرآن مجید میں اسی شیوہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یہ جواب، امام جعفر صادق علیہ السلام[10] کی ایک روایت میں پیش کیا گیا ہے اور امامؑ اپنے کلام کی تائید میں تین مثالیں پیش کرتے ہیں: ایک یہ کہ نماز کے بارے میں قرآن مجید نے مسئلہ کو اجمالی طور پر بیان فرمایا ہے اور یہ نہیں کہا ہے کہ ہر نماز کی کیفیت وکمیت کیسی ہے اور کس طریقہ سے بجا لانی چاہئے ۔لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے لئے نماز کو بجالانے کا طریقہ اور ہر نماز کی رکعتوں کی تعداد بیان فرمائی ہے۔ اس کے بعد زکات کے

مسئلہ کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ زکات کا مسئلہ قرآن مجید میں صرف ایک اصل کے طور پر بیان ہوا ہے، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معین فرمایا ہے کہ زکات کن چیزوں سے متعلق ہے اور ہر ایک کا نصاب کس قدر ہونا چاہئے۔ اور پھر احکام حج کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں صرف حج کے واجب ہونے کا ذکر آیا ہے لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے طریقہ کو ذاتی طور پر مسلمانوں کے لئے بیان فرمایا ہے۔[11]

اس لئے اگر ہم یہ توقع رکھیں کہ قرآن مجید تمام مسائل کے بارے میں تفصیلات اور جزئیات بیان کرے تو ہماری یہ توقع بے جا ہے۔ اگر ائمہ اطہارؑ کے اسمائے گرامی ایک ایک کر کے قرآن مجید میں بیان نہیں ہوئے ہیں تو یہ مکتب اہل بیتؑ سے عدم تمسک کی دلیل نہیں بن سکتی ہے، چنانچہ قرآن مجید میں نہیں آیا ہے کہ نماز ظہر چار رکعت ہے اس لئے اس بہانہ سے اس کو دو ہی رکعت میں نہیں پڑھا جاسکتا ہے، اور چونکہ قرآن مجید میں نہیں آیا ہے کہ حج میں کعبہ کے گرد سات چکر لگانے چاہئے، اس بہانہ سے طواف کو ترک نہیں کیا جاسکتا ہے۔

۲) ایسے مسئلہ میں کہ مخالفت کا زیادہ احتمال ہو، مصلحت یہی ہے کہ اسے قرآن مجید غیر مستقیم طور پر بیان کرے، کیونکہ احتمال ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کی امامت کے مسئلہ سے مخالفت کا دامن قرآن مجید تک پھیل جائے اور یہ مسئلہ مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف ہے، لیکن قابل توجہ بات ہے کہ خداوند متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝ [12] ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا اور ہم خود اس کے محافظ ہیں۔ قرآن مجید کو تحریف اور کم و زیادہ ہونے سے بچانے کا ایک طریقہ یہی ہے کہ احتمال مخالفت والے مسائل ایسے بیان کئے جائیں تاکہ مسلمان نما منافقین کو قرآن مجید میں تحریف کرنے کا بہانہ نہ ملے اور اس طرح قرآن مجید کی قدر ومنزلت اور احترام کو دھچکا نہ پہونچے۔[13]

آیت اللہ شہید مطہری اپنے بیانات میں: اس مطلب کے بارے میں کہ قرآن مجید نے حضرت علی علیہ السلام کی امامت و خلافت کو کیوں نام کے ساتھ ذکر نہیں کیا ہے؟ اس طرح جواب دیتے ہیں کہ اولاً: قرآن مجید اس امر پر مبنی ہے کہ مسائل کو اصل کی صورت میں بیان کرے اور ثانیاً: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا خداوند متعال اس مسئلہ کو اس صورت میں بیان کرنا نہیں چاہتے ہیں، کیونکہ بالآخر اس میں نفسانی خواہشات کی مداخلت کا احتمال تھا۔ جس صورت میں مسئلہ پیش کیا گیا ہے، اس کے بارے میں بھی توجیہ اور اجتہاد کر کے چہ میگوئیاں کی گئی ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد چنین و چنان تھی، یعنی اگر اس سلسلہ میں کوئی صریح آیت بھی موجود ہوتی تو، پھر بھی کوئی نہ کوئی توجیہ کرتے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بیان میں وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے: ذا علی مولاہ اس سے بھی واضح تر کیا ہونا چاہئے؟! لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس واضح کلام کی نافرمانی کرنے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد قرآن مجید کی کسی واضح آیت کی نافرمانی کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لئے میں نے اپنی کتاب خلافت و ولایت کے مقدمہ میں یہ جملہ نقل کیا ہے کہ حضرت امیر المؤمنینؑ کے زمانہ میں ایک یہودی، صدر اسلام کے ناگفتہ بہ حوادث کے سلسلہ میں تمام مسلمانوں پر طعنہ زنی کرنا چاہتا تھا (حقیقت میں قابل طعنہ زنی بھی ہے) اس نے حضرت علیؑ سے مخاطب ہو کر کہا: **مادفنتم نبیکم حتی اختلفتم فیہ** ابھی اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دفن بھی نہ کر پائے تھے کہ تم لوگ ان کے بارے میں اختلاف سے دوچار ہو گئے! امیر المؤمنینؑ نے جواب میں فرمایا: **انا اختلفنا عنہ لافیہ ولکنکم ماجفت ارجلکم من البحر حتی قلتم لنبیکم: اجعل لنا الھا کما لھم آلہ. فقال انکم قوم تجھلون**۔ ہم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اختلاف نہیں کیا ہے، ہمارا اختلاف ایک حکم کے بارے میں تھا، جو ہمیں اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ملا تھا، لیکن تمہارے پاؤں دریا کے پانی سے ابھی

خشک نہیں ہوئے تھے، کہ تم لوگوں نے اپنے پیغمبر سے مطالبہ کیا کہ توحید کے بنیادی اصول کو پامال کرنے کی اجازت دے دو اور ان سے کہا کہ ہمارے لئے ان کے مانند ایک ایسا بت بنادو۔ اس لئے جو کچھ ہمارے ساتھ پیش آیا اور جو کچھ تمہارے ساتھ پیش آیا ہے اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ہم نے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ ہم نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کا مفہوم اور مراد کیا ہے؟ ان دو کے درمیان کافی فرق ہے کہ جو کام انجام دیتے تھے اس کی خارج میں یوں توجیہ کرتے (نہ یہ کہ حقیقت میں ایسا تھا) اور کہتے کہ جنہوں نے یہ غلطی کی ہے، انہوں نے خیال کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد یہ تھی، اور نتیجہ کے طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی اس طرح توجیہ کی، اور یا یہ کہیں کہ قرآن مجید کی نص کو اس وضاحت کے باوجود پامال کیا گیا ہے یا قرآن مجید کی تحریف کی گئی ہے۔[14]

اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام یا کم از کم امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام کے نام کا قرآن مجید میں وضاحت کے ساتھ ذکر نہ ہونا قرآن مجید کو تحریف اور کم و زیادہ کرنے سے بچانا تھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آیات تطہیر [15]، تبلیغ [16]اور ولایت[17]، بالترتیب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے متعلق آیات یا احکام سے متعلق آیات اور یا اہل کتاب سے عدم دوستی سے متعلق آیات کے بیچ میں آئی ہیں کہ بظاہر ان کا ائمہ اطہار علیہم السلام اور حضرت علی علیہ السلام کی ولایت سے کوئی ربط نہیں ہے۔لیکن ایک انصاف پسند محقق تھوڑی سے غور وحوض کے بعد متوجہ ہوسکتا ہے کہ آیت کے اس حصہ کا سیاق اس کے ماقبل اور مابعد آیات سے مختلف ہے اور یہ آیات ایک خاص مقصد کے پیش نظر ایسی جگہوں پر رکھی گئی ہیں۔[18]

حواشی

[1]۔ ابن البطریق، العمدہ، ص۱۲۱، و۱۳۳، سید ہاشم بحرانی، غایہ المرام،ص۳۲۰، علامہ امینی، ج۲،

ص ۲۷۸۔

[2]۔ یہ حدیث متواتر ہے اور شیعوں وسنیوں کی کتابوں میں درج ہے۔ کتاب الغدیر میں اس حدیث کو نقل کرنے والوں کے نام ترتیب سے پہلی صدی سے چودہویں صدی تک طبقہ بندی کر کے ذکر کئے گئے ہیں۔ ان میں ۱۰۰ افراد اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کہ جو اہل سنت کی کتابوں میں اس حدیث کے راوی تھے اور ان کے نام مذکورہ کتاب میں درج کئے گئے ہیں اور اس کے علاوہ کتاب عبقات الانوار میں میر حامد حسین نے حدیث کے متواتر ہونے کو ثابت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: الغدیر ص۱۴۔ ۱۱۴،ابن المغاز لی، مناقب،ص ۲۵ ۔ ۲۶ ،مطہری، مرتضی، امامت ورہبری،ص ۷۲ ۔ ۷۳ ۔

[3]۔ العمدہ،ص ۱۷۳۔ ۱۷۵، احمد بن حنبل، مسند احمد،، ج ۳،ص ۳۲، الغدیر، ج۱۔ ،ص۵۱، ج ۳، ص ۱۹۷-۲۰۱۔

[4]۔ حضرت علی علیہ السلام کی امامت سے مربوط احادیث کے متواتر ہونے کو ثابت کرنے کے لئے کتاب الغدیر اور کتاب عبقات میں بہت کوششیں کی گئی ہیں ۔اہل سنت کے فاضل قوشجی نے بھی ان میں سے بعض روایتوں کے متواتر ہونے کو مسترد نہیں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: شرح قوشجی بر تجرید الاعتقاد، خواجہ ی طوسی۔

[5]۔ محمد بن حسن حر عاملی، اثبات الہدا، ج ۳،ص ۱۲۳،سلیمان بن ابراہیمؑ قندوزی، ینابیع المودہ،ص ۴۹۴، غایہ المرام،ص ۲۶۷، ج ۱۰ بہ نقل از مصباح یزدی، آموزش عقاید، ج ۲،ص ۱۸۵۔

[6]۔ وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ؕ﴿۳﴾ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى ۙ﴿۴﴾، نجم، ۳، ۴۔

[7]۔ ملاحظہ ہو: تفسیر کی کتابیں، زیر بحث آیت کے ذیل میں، جیسے: فخر رازی التفسیر الکبیر، ج ۱۲،ص ۲۵، تفسیر نمونہ، ج ۴،ص ۴۲۱ ۔، ۴۳، جلال الدین سیوطی، دار المنثور، ج ۲،ص ۳۹۳ اس کے علاوہ اہل سنت کی احادیث کی کتابوں میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے، جیسے ذخایر العقبی محب الدین طبری،ص ۸۸، نیز جلال الدین سیوطی، لباب النقول،ص ۹۰، علا الدین علی المتقی، کنز العمال، ج ۶،ص ۳۹۱ تفسیر نمونہ، ج ۴،ص ۴۲۵ ۔

[8]۔ تحلیل از کتاب امامت ورہبری، اثر استاد مطہری،ص ۳۸ سے نقل کیا گیا ہے۔

[9]۔ انما علم نحو کے علما کے مطابق حصر پر دلالت ہے، ملاحظہ ہو: مختصر المعانی۔

[10]۔ کلینی، کافی، کتاب الحجہ، باب ما نص اللہ ورسولہ علی الائمہ واحداً فواحداً، ج ۱۔

[11]۔ روایت کا متن یوں ہے: عن ابی بصیر قال: سالت ابا عبداللہ علیہ السلام عن قولہ اللہ عز

وجل اطیعو اللہ واطیعو الرسول واولی الامر منکم ،فقال علیہ السلام نزلت فی علی بن ابی طالب والحسن والحسین فقلت له: ان الناس یقولون: فماله لم یسم علیا واهل بیته فی کتاب الله عز وجل؟ قال علیہ السلام قولوا لهم: ان رسول الله نزلت علیه الصلاه ولم یسم الله لهم صلاثاً واربعا ،حتی کان رسول الله هو الذی فسر لهم ذلك .ونزلت علیه الزکاه ولم یسم لهم من کل اربعین درهماً ،حتی کان رسول الله هو الذی فسر لهم ذلك. ونزل الحج فلم یقل لهم طوفوا اسبوعاً حتی کان رسول الله هو الذی فسر لهم ذلك۔

[12]۔ اس نکتہ کو آیت اللہ ہادوی تہرانی نے اپنے درس مبانی کلامی اجتہاد میں بیان فرمایا ہے کہ کتاب مبانی کلامی اجتہاد کی جلد ۲ میں شائع ہوگا۔

[13]۔ایضاً۔

[14]۔امامت ورہبری،ص۱۰۹۔۱۱۰،طبع،۲۷،انتشارات صدرا،تہران،۱۳۸۱۔

[15]۔ احزاب،۳۳: اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾ بس اللہ کا ارادہ ہے اے اہل بیت کہ تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔ مذکورہ آیت کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے متعلق آیات کے بیچ میں لایا گیا ہے۔

[16]۔ مائدہ، ۶۷: يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ: اے پیغمبر! آپ اس حکم کو پہنچادیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو گویا اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ یہ آیت مردار اور حرام گوشت کے بارے میں احکام سے متعلق آیات کے بیچ میں درج ہوئی ہے۔

[17]۔ مائدہ، ۵۵: اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ ... یہ آیت یہود ونصاری سے عدم دوستی سے متعلق آیات کے ذیل میں آئی ہے۔

[18]۔ یہ نکتہ بھی آیت اللہ ہادوی تہرانی کے دروس مبانی کلامی اجتہاد سے استفادہ کیا گیا ہے کہ اس کتاب کی دوسری جلد میں شائع ہوگا۔

برہان نظم کیا ہے؟

مختصر جواب

۱)خداوند متعال کے وجود کی معرفت اور اثبات کے سلسلہ میں بیان ہونے والے برہان اورطریقے متعدد ہیں اوران میں گونا گوں روشوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

روش کے لحاظ سے یہ برہان تین حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں: نفسیاتی یافطری راہ، علمی وفلسفی نماراہ اورفلسفیانہ راہ۔ برہان نظم،علمی وفلسفی نماراہ کے موارد میں سے ایک ہے۔

۲) خدا وند متعال کے اثبات کے دلائل اور ہیں،صحیح و کامل ہونے، یا معیوب و فاسدہونے،قدرومنزلت ومحدودیت، اورنتائج ومقصود کے لحاظ سے متفاوت ہیں اورایک سطح پر مساوی نہیں ہیں۔ برہان نظم،من جملہ برہانوں میں سے ہے کہ جو دوسرے برہانوں سے سہارا لینے کی محتاج ہےاوراسی وجہ سے اسلامی حکما وفلاسفہ نے واجب الوجود کی ذات کوثابت کرنے کے لئے اس برہان سے استفادہ نہیں کیا ہے۔

۳) برہان نظم کا حکمت الٰہی کے مسئلہ سے ایک نزدیکی رابطہ ہے اور یہ ان مسائل میں سے ہےجن کی وضاحت کرنے کے لئے ایک الگ فرصت کی ضرورت ہے۔

٤)برہان نظم کی اجمالی شکل کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے: کائنات منظوم (ایک نظم پر مبنی) ہےاور ہرمنظوم کا ایک ناظم ہوتا ہے، پس کائنات کا ایک ناظم ہے۔ پہلا مقدمہ تجرباتی ہےاور دوسرا مقدمہ عقلی ہے۔

۵) ناظم سے مراد، ایک مشخص، خارجی و عینی موجود ہے، جو مخلوقات کے داخلی اور غائی (آخری) نظام میں خاص نظم و ہم آہنگی کے وجود میں آنے کا سبب بن جاتا ہے۔

٦) برہان نظم کا تعارف کو، نظم کی تعریف، نظم کے اقسام، اثبات وجود نظم اور نظم کی دلیل و کیفیت کے بارے میں چند مطالب کا ذکر پیش کیا جا سکتا ہے۔

۷) نظم، یا اعتباری ہے یا صناعی اور یا تکوینی (طبیعی) ہے۔ نظم اعتباری، اعتبار کر نے والوں سے حاصل ہوتا ہے اور نظم صناعی، خاص صنعت حرفت کے قانون کی بنیاد پر آمادہ و استعمال ہوتا ہے اور نظم طبیعی و تکوینی، تکوین وحقیقت کے محور پر پایا جاتا ہے۔

۸) نظم طبیعی، کے بھی کئی اقسام ہیں: ایک محدود نظام کے عناصر کی اندرونی ہم آہنگی، ہستی کے عناصر کی مجموع ہستی میں ہم آہنگی، فعل و فاعل کی سنخیت میں ہم آہنگی، اور علل غائی (انتہائی) کے سلسلہ میں ہر فعل کے اس کی مخصوص غایت کے ساتھ ہم آہنگی اور ضروری رابطہ۔ برہان نظم میں بحث کا محور وہی داخلی اور غائی (آخری) نظم ہے۔

۹) نظم تکوینی کا محور و متعلق کبھی مادی و طبیعی مخلوقات ہوتے ہیں، کبھی مثالی (مجرد مثالی) مخلوقات اور کبھی عقلی مخلوقات (مجرد عقلی) ہوتے ہیں۔ اور جو برہان نظم اور یا اس کی تنقید کرنے والوں کا مرکز نظر ہے، وہ وہی مادی مخلوقات کا طبیعی نظم ہے۔

۱۰) مجموع ہستی میں اثبات نظم (عالم فطرت، عالم مثال اور عالم عقل) برہان عقلی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۱۱) قرآن مجید، مشرکین کے مقابل میں، جو خالق اور مخلوقات میں اصل تدبیر کے وقوع کے قائل ہیں، برہان نظم سے استفادہ کرتے ہوئے جدال احسن سے کام لیتا ہے۔ شب وروز میں نظم اور پہاڑوں کے ذریعہ زمین کا سکون وغیرہ فطرت میں موجود نظم کے نمونے ہیں، جنہیں قرآن مجید میں مبدا ہستی کے آیات اور نشانیوں کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

۱۲) امام صادق علیہ السلام، عالم ہستی کے منظم ہونے اور شب و روز کے ایک دوسرے کے پیچھے قرار پانے کو کائنات کے ناظم اور مدبر کی توحید کے دلائل سمجھتے ہیں۔

تفصیلی جواب

خداوند متعال کی معرفت اور اثبات وجود کے لئے جو برہان اور دلائل پیش کئے گئے ہیں، وہ متعدد ہیں اور ان میں مختلف طریقوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ایک اجمالی تقسیم بندی میں ان دلائل و برہان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

نفسیاتی یا فطری راہ، علمی و فلسفی نما راہ اور فلسفیانہ راہ۔ برہان نظم کو علمی و فلسفی نما راہ کی اقسام میں سے ایک قسم شمار کیا جا سکتا ہے۔[1]

برہان نظم کی تشریح بیان کرنے سے پہلے، اس مطلب کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے کہ خدا وند متعال کے وجود کو ثابت کرنے کے برہان اور دلائل، صحیح و کامل ہونے، یا معیوب و فاسد ہونے، قدر و منزلت و محدودیت، نتائج و مقصود، ان میں سے ہر ایک پر کی گئی تنقید اور اشکالات کے سلسلہ میں دیئے گئے جوابات، حسی و تجربات مقدمات سے استفادہ کرنے اور حتی کہ اس سلسلہ میں پیش کئے گئے تالیفات و بیانات کے لحاظ سے یکساں اور ہم سطح نہیں ہیں اور اس مطلب کو مدنظر رکھنے کے نتیجہ میں گمراہی کی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے۔[2]

اس لحاظ سے، خداوند متعال کو ثابت کرنے کے سلسلہ میں جو برہان قائم کئے جاتے ہیں، انہیں، صحیح و غلط، کمال و نقص اور یقین حاصل کرنے کی شرائط کے لحاظ سے مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

الف) وہ دلائل و برہان، جو ناقص، خراب و فاسد اور کھوکھلے اور یقین حاصل کرنے کے سلسلہ میں ضروری شرائط کے فاقد ہوں۔ اس قسم کے برہان و دلائل، حقیقت میں برہان

نہیں ہیں۔

ب) وہ برہان ودلائل جو فاسد اور خراب نہیں ہیں، لیکن ناقص ہوتے ہیں اور مکمل صورت میں واجب الوجود کو ثابت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔ اس قسم کے برہان کا اہم کام خداوند متعال کے اوصاف میں سے کسی وصف اور اسمائے الٰہی میں سے کسی اسم کو ثابت کرنا ہے اور واجب الوجود (خداوند متعال) کو ثابت کرنے کے لئے یہ برہان دوسرے برہان کا سہارا لینے کے محتاج ہوتے ہیں۔ برہان نظم اسی قسم کا برہان ہے۔

ج) وہ برہان و دلائل، جو صحیح اور مکمل ہیں اور اپنے مطلوب یعنی اثبات واجب الوجود کو صراحت سے انجام دے سکتے ہیں۔[3]

برہان نظم: جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا کہ خدا کی معرفت کی علمی (حسی) وفلسفہ نما راہوں میں سے ایک راہ، برہان نظم ہے۔ اس برہان میں ایک حسی وتجرباتی مقدمہ ہے جس سے استفادہ کیا جاتا ہے، اس معنی میں کہ ہم خارجی وفطری واقعات اور مخلوقات کا حسی وتجرباتی مطالعہ اور وآیات الٰہی کا مشاہدہ کر کے، اور استدلال برہانی میں ان سے استفادہ کر کے مطلوبہ نتیجہ حاصل کرتے ہیں۔ اسی لئے برہان نظم صرف حسی وتجرباتی استدلال نہیں ہے بلکہ اس میں عقل ومقدمہ عقلی کی بنیاد بھی ہے۔[4]

برہان نظم پر غور وتحقیقات، بعض بزرگوں کی تعبیر میں، مشہور ترین، معروف ترین اور عام ترین دلیل ہے، جس کو علمائے دین نے وجود خدا کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔[5] یہی دلیل اور نظام موجودات کا مسئلہ (مستحکم نظام) ہے کہ جسے آیہ شریفہ صنع اللہ الذی اتقن کل شئی [6] سے استفادہ کر کے اتقان صنع (مستحکم صنعت) کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ برہان نظم کا حکمت الٰہی کے مسئلہ سے نزدیکی رابطہ ہے۔ یہاں پر اس سلسلہ میں بحث کرنے کی گنجائش نہیں بلکہ اس کے لئے الگ سے فرصت کی ضرورت ہے۔[7] یہ بات قابل ذکر

ہے کہ اسلامی فلسفہ نے برہان نظم میں موجود محدودیتوں کے پیش نظر واجب الوجود کی ذات کو ثابت کرنے کے سلسلہ میں اس سے استفادہ نہیں کیا ہے۔[8]

برہان نظم کو مختلف صورتوں میں پیش کیا جاسکتا ہے، لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا چکا ہے کہ، اس صورت میں جو بھی نتیجہ حاصل ہو جائے وہ دو مقدموں پر منحصر ہے ان میں سے ایک تجرباتی اور دوسرا علمی مقدمہ ہے۔[9] مقدمہ علمی وہی قیاس (ہر نظم ایک ناظم کا محتاج ہے) کا کبریٰ ہے، ایک ایسے قیاس پر اعتماد کئے بغیر نتیجہ نہیں نکلتا ہے، جس نے حرکت، حدوث یا امکان سے استفادہ کیا ہو، اس کے مانند کہ کہا جاتا ہے: نظم حادث یا ممکن کی ایک حقیقت ہے اور ہر حادث یا ممکن کے لئے ایک محدث مبدا یا واجب الوجود کی ضرورت ہے، پس نظم کا بھی ایک مبدا محدث یا واجب الوجود ہے۔

البتہ، چونکہ اس مبدا سے نظم صادر ہوتا ہے، اس لئے اسے ناظم بھی کہا جاتا ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ برہان نظم، جس حد میں بھی نتیجہ دینا چاہے، ایک دوسرے برہان کا محتاج ہے اور یہ ایک مستقل برہان شمار نہیں ہوسکتا ہے۔[10]

دوسری جانب چونکہ برہان نظم کسی دوسرے برہان کی مدد سے مبدا ناظم کو ثابت کرتا ہے اور جو فعل ناظم سے صادر ہوتا ہے وہ (نظم) عالمانہ ہے، علم کی صفت بھی ناظم کے لئے ثابت کی جاسکتی ہے۔[11]

نظم کی اجمالی صورت یوں بیان کی جاسکتی ہے: نظم موجود ہے، یعنی عالم منظوم (صاحب نظم) ہے ۔ اور ہر منظوم کا ایک ناظم ہوتا ہے، اس لئے کائنات کا ایک ناظم ہے۔[12] برہان نظم کی معرفت کے لئے چند امور ضروری ہیں: ۱۔نظم کی تعریف (نظم کی کیفیت) ۲۔نظم کی قسمیں ۳۔نظم کے وجود کا ثبوت ٤۔نظم کی دلیل اور ضرورت۔[13]

نظم کی تعریف: چنانچہ بعد میں بیان ہوگا کہ، نظم، چیزوں کے درمیان ایک قسم کا

رابطہ ہے اور جو نظم کو وجود میں لاتا ہے، وہی وجود اور وجودی رابطہ ہے، اور وجودی ربط تکوینی نظم میں حاصل ہوتا ہے، اس لئے، ایک محدود مجموعہ کے مختلف اجزا کے جمع ہو کر آپس میں تعاون اور ہم آہنگی، یا مجموع ہستی اور یا فعل کی فاعل سے سنخیت یا فعل کی غایت سے ضروری رابطہ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی چیز سے نظم کی تعریف کی جاسکتی ہے۔[14] اگر چہ وجودی رابطہ کی ہر قسم میں وجود کی اسی قسم سے مربوط مخصوص نظم کا وجود ہوگا۔

نظم کی قسمیں: اس لحاظ سے لفظ نظم سے جو چیز ابتدا میں ذہن میں پیدا ہوتی ہے، وہ ایک قیاسی اور نسبتی امر ہے (جو دو یا چند چیزوں کے خاص شرائط میں موازنہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے) اور قیاس و موازنہ، کبھی اعتباری، صناعی و تکوینی (وفطری) میں تقسیم ہوتا ہے۔ نظم اعتباری اعتبار اور اعتبار کرنے والے کی قرارداد سے حاصل ہوتا ہے اور مختلف حالات میں متفاوت ہوتا ہے، جیسے سپاہیوں کی صف کے نظم کے مانند یا نماز گزاروں کی صف کے مانند۔ نظم صناعی جو صنعت وحرفت کے خاص قانون کو آمادہ کر کے پیش کیا جاتا ہے، ریڈیو، گھڑی وغیرہ کے نظم کے مانند۔ فطری و تکوینی نظم جو تکوین وحقیقت کے محور پر پایا جاتا ہے اور خارجی مخلوقات کے قیاس سے حاصل ہوتا ہے، اس کے اپنے خاص قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔

برہان نظم میں زیر بحث موضوع، فطری و تکوینی نظم ہے نہ کہ اعتباری یا اس کی صناعی قسم، اگر چہ اس قسم (صناعی) سے مدد چاہنے والے متعلم کے ذہن کی تائید کے لئے[15] قیاس تمثیلی سے مدد لی جائے۔ مثلا جب انسان ایک جزیرہ میں ایک گھڑی کو دیکھتا ہے، گھڑی کا صنعتی نظم مشاہدہ کرنے والے کو ناظم اور اس کے بنانے والے کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور تمثیل میں، تکوینی نظم کے صناعی نظم سے مشابہت نظم تکوینی کی نسبت وجود ناظم کا استدلال ہوتا ہے۔[16]

فطری وتکوینی نظم کی قسمیں: فطری وتکوینی نظم کو تحقق بخشنے والے (فطرت وتکوین میں) وجودی ربط کی تین قسمیں ہیں، کیونکہ وجودی ربط صرف علت ومعلول کے محور پر ہے اور جو امور آپس میں علت ومعلول کا رابطہ نہیں رکھتے ہیں، باہمی نسبت کے سلسلہ میں ان پر کسی قسم کا نظم نہیں ہوگا اور علت ومعلول کا رابطہ تین حالتوں سے خالی نہیں ہے: ۱۔ علت فاعلی کا رابطہ ۲۔ علت غائی کا رابطہ ۳۔ علت قوام (داخلی) کا رابطہ۔

پہلی قسم جو علت فاعلی کا معلول سے رابطہ ہے، اس کا نظم عبارت ہے فعل کی خاص سنخیت کا فاعل کے مطابق ہونا ہے۔ **کل یعمل علی شاکلہ** ورنہ ہر اثر، ہر موثر سے متوقع ہوگا اور ہر موثر کا ایک اثر ہوگا، کہ یہ امر وہی توافق اور قانون علیت ومعلولیت کا انکار ہوگا۔

دوسری قسم، یعنی علت غائی کا معلول سے رابطہ، اس کا نظم بھی عبارت ہے: رموجود غیر واجب کے لئے معین مقصد کے ساتھ مخصوص تکاملی رابطہ کی ضرورت ہے، ورنہ ایک چیز ہر طرف رجحان پیدا کرے گی اور ہر مخلوق کا خاتمہ اور معاد کوئی دوسری چیز ہوگی اور یہ ناہم آہنگی غائی، غیر ہم آہنگی فاعلی کے مانند ہوگی، جو ہرج ومرج کا سبب بن جاتا ہے۔

تیسری قسم، یعنی ایک چیز کے اجزا کا داخلی رابطہ، یہ اس چیز سے مربوط ہے جو مادہ وصورت، جنس وفصل یا عناصر اور متعدد ذرات پر مشتمل ہو اور وہ چیز جو خارجی طور پر وسیع ہو، خارج کے لحاظ سے اس کے لئے داخلی نظم تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اگر چہ جنس وفصل وغیرہ کے مانند ترکیب کے لحاظ سے نظم داخلی اس کے لئے معقول ہو۔ اور جو چیز وسعت ذہنی کی حامل ہے، جس طرح اس کے لئے خارج کے لحاظ سے نظم داخلی قابل تصور نہیں ہے، ذہن کے لحاظ سے داخلی نظم اس کے لئے معقول نہیں ہوگا۔[17]

اندرونی اور داخلی نظم بھی دو قسم کا ہوسکتا ہے: وہ نظم جو مجموع ہستی کے اندر ہستی کے عناصر کی ہم آہنگی سے حاصل ہوتا ہے۔[18]

البتہ، اس قسم کے نظم، مذکورہ اقسام تک محدود نہیں ہیں اور عقلی طور پر محدود نہیں ہیں بلکہ ممکن ہے کچھ اور قسمیں بھی ان میں اضافہ ہو جائیں۔ اس کے علاوہ بعض مذکورہ اقسام عدد عاد ہو سکتے ہیں۔[19]

دوسرے الفاظ میں چار قسم کے نظم پائے جاتے ہیں:

الف) ایک محدود نظام کی داخلی ہم آہنگی۔

ب) مجموع ہستی میں، ہستی کے عناصر کی ہم آہنگی۔

ج) فعل کی فاعل سے ہم آہنگی اور ایک ہی قسم کا ہونا۔

د) علل غائی کے سلسلہ میں ہر فعل کی اسی فعل سے مخصوص مقصد کے سلسلہ میں ضروری ہم آہنگی ورابطہ۔

ہر نظم میں نتیجہ کا اختلاف: نظم جب ایک محدود نظام کی اندرونی ہم آہنگی یا ستی کے مجموع ہستی میں عناصر کی ہم آہنگی کی صورت میں حاصل ہوتا ہے یہ اس نظم کے علاوہ ہے کہ جو علل فاعلی کے سلسلہ میں فعل کے فاعل سے سنخیت کے نتیجہ میں علل غائی کے سلسلہ میں ہر فعل کے اسی فعل کی مخصوص غایت سے ضروری رابطہ کے نتیجہ میں وجود میں آتا ہے جو برہان ایک نظام کے عناصر کی ہم آہنگی سے استفادہ کر کے وجود میں آتا ہے، وہ تمام ہونے کی صورت میں غایت بالذات یعنی پہلے فاعل تک نہیں پہنچتا ہے اور صرف ایک مبدا وعلت کو ثابت کرتا ہے کہ جو معین ہم آہنگی کا حامل ہوتا ہے اور اسی کے بارے میں آگاہ ہے اور اس قسم کا فاعل ایک امر ممکن، حادث یا متحرک ہوسکتا ہے۔حتی اگر مجموع ہستی کا عمومی نظم بھی استدلال کا محور قرار پائے، تو اس کا ناظم ایک عالم وقادر مجرد موجود ہوسکتا ہے جو ہم آہنگ مجموع سے خارج ہو، اور واجب بھی نہ ہو، اس صورت میں برہان نظم تمامیت اور واجب الوجود کے اثبات کے لئے برہان امکان سے استفادہ کیا جانا چاہئے۔[20]

جو چیز برہان نظم میں مرکز بحث ہے، وہ وہی (ہم آہنگی اور) داخلی نظم اور نظم غائی ہے[21] اور بیشتر وہی ہم آہنگی مراد ہے جو ایک مجموعہ کے عناصر اور افعال ورفتار اور مختلف اعضا کے ایک خاص مقصد حاصل کرنے میں مشہود ہے اور یہ مقصد ایسا ہوتا ہے جو فعل ورفتار کی حد میں عناصر اور اعضا میں سے کوئی ایک الگ سے قرار نہیں پاتا ہے۔وقت اور زمان کو ایک گھڑی کے اجزا کی رفتار ہم آہنگ کے توسط سے معین کرنے کے نظم صناعی کے مانند اور حتی کہ ایک بورڈ پر آرٹسٹ کی مختلف رنگوں کی ترکیب کا کام جو مشاہدہ کرنے والے کے لئے لذت ونشاط مہیا کرتا ہے۔اور شاید، مشابہ فاعلوں کے توسط سے مشابہ فعل کی تکرار اور مقدمہ صغریٰ کے مانند نظم کو قرار دینے والوں نے نظام علی عالم میں فعل کے فاعل کے ساتھ ہم آہنگی اور یکسانیت کا بھی اسی قیاس پر تجزیہ کیا ہے۔[22]

اثبات وجود نظم (ہستی نظم): نظم کی تعریف اور اقسام کرنے کے بعد، وجود نظم کو ثابت کرنا چاہئے۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا کہ، برہان نظم کا پہلا مقدمہ (صغری) وجود نظم (تکوینی، نہ کہ نظم اعتباری وصناعی) ہے۔[23]

نظم تکوینی کے محور اور متعلق کبھی مادی اور فطری مخلوقات ہوتی ہیں، کبھی عالم مثال کی مخلوقات (مجردات مثالی) اور کبھی مخلوقات عالم عقل (مجردات عقلی) ہوتی ہیں۔[24]

برہان نظم کو پیش کرنے والوں اور اس کی تنقید کرنے والوں کی نظر میں وہی مادی مخلوقات کا فطری نظم ہے[25] جس کو ثابت کرنے کی ذمہ داری علوم تجرباتی کو ہے۔

لیکن نظم کی تعریف اور تجزیہ کے پیش نظر، جو دو یا چند چیزوں کا آپس میں ضروری جوڑ اور رابطہ ہے، برہان نظم کا تجرباتی مقدمہ (صغری) ایک تجرباتی مقدمہ ہے نہ کہ حسی کیونکہ حس کو فطری امور کے مشاہدہ سے جو زیادہ سے زیادہ استفادہ ہوتا ہے، ان اشیا کا ادراک ہے، جو آپس میں یکے بعد دیگرے اور عد دعاد کی صورت میں قرار پاتے ہیں ۔ اور نظم (

ضروری جوڑ اور رابطہ) احساس کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔[26]

برہان نظم میں اگر وجود نظم فطرت کے ایک حصہ میں مراد ہوتو جو نتیجہ برہان کے کبری (ہر نظم کا ایک ناظم ہے) کوضمیمہ کر کے حاصل ہوتا ہے وہ اسی حد میں نظم کو ثابت کرے گا اور پوری فطری کائنات مدنظر ہوتو، پھر بھی نتیجہ اسی عالم فطرت کی حد میں ہوگا کہ عالم فطرت کے لئے ایک مدبر و ناظم کا وجود ضروری ہے اور چونکہ مشاہدہ، حس اور تجربہ سے عالم فطرت کے ایک حصہ تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے، اس لئے اس راہ میں کوئی خاص مشکل نہیں ہوگی۔[27]

لیکن جو مجموعہ ہستی (عالم فطرت، عالم مثال اور عالم عقل) میں نظم کو ثابت کرنے کے درپے ہو، اس کے لئے یہ کام برہان عقلی کے سوا ممکن نہیں ہے۔[28]

برہان لم[29]، یعنی عالی اصولوں کو مدنظر رکھنے کے طریقہ سے اور اوصاف و اسمائے الٰہی کے ذریعہ نہ صرف فطری نظم یا کائنات کے کلی نظم کو ثابت کیا جاسکتا ہے بلکہ موجودہ نظام کے احسن ہونے کو بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔

لیکن جو شخص برہان لم کے طریقہ سے نظم و ہم آہنگی کے ثبوت یا نظام کے احسن ہونے کا استدلال کرتا ہے، وہ اصل نظام کو پانے سے پہلے مبدا کے وجود سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔[30]

نظم کی علت ودلیل: اب یہ سوال کہ عالم میں (فطرت کے ایک حصہ میں یا پوری کائنات میں یا مجموعی ہستی میں) کیوں نظم موجود ہے؟ یہ وہی قیاس میں کبری کی بحث ہے کہ کس علت فاعلی کے سبب نظم پایا جاتا ہے۔ اگر موجودہ نظم کے لئے، کوئی ناظم اور مبدا فاعلی موجود نہ ہو اور نظم اتفاقی طور پر وجود میں آیا ہو، تو استدلال کا دوسرا مقدمہ (کبری) کہ ہر نظم کا ایک ناظم ہے، صحیح نہیں ہوگا کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتو اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ پورا نظم، ناظم

کے بغیر وجود میں آئے یا نظم کا ایک حصہ اتفاقاً وجود میں آئے اور اس کا دوسرا حصہ ایک ناظم کے توسط سے وجود میں آئے۔[31]

ناظم سے مراد، ایک مشخص، خارجی و عینی موجود ہے جو فطری مخلوقات کے داخلی یا غائی نظام میں مخصوص نظم و ہم آہنگی کے وجود میں آنے کا سبب ہوتا ہے اور اس نظم کے تحقق کے لئے اس کا وجود ضروری ہے۔ اس لئے نظم کے اتفاقاً وجود میں آنے کے احتمال کو بالکل مسترد کرنا چاہئے۔[32]

قرآن مجید میں برہان نظم کا استفادہ: برہان نظم میں پائی جانے والی محدودیتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے، جن میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا گیا، اس برہان کا ان لوگوں کے مقابل میں استفادہ کرنا، جو نظم فطرت کے بعض حصوں میں یا پورے عالم میں قبول کرتے ہیں اور ذات واجب الوجود اور تخلیق و توحید پر یقین رکھتے ہیں، مفید ہے۔

ہر ممکن الوجود خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ قرآن مجید آسمانوں، زمین، نفوس و ابدان، ذی روح وغیر ذی روح کو خدا کی نشانیاں جانتا ہے اور ان سب کے بارے میں آیہ کے عنوان سے یاد کرتا ہے اور منظم موجودات کو، مختلف جہات سے مبدأ ہستی کی ایک نشانی و آیت جانتا ہے۔[33]

شب و روز کے لحاظ سے مختلف موسموں میں یا ایک موسم میں نظم زمان، مختلف مکانات میں یا پہاڑوں کے توسط سے سکون مہیا کرنے کا زمین میں نظم، عالم طبیعت میں موجود نظم کے نمونے ہیں کہ ان سب کا ذکر کرنا اس تحریر کے طولانی ہونے کا سبب بن جائے گا۔[34]

اسی لئے قرآن مجید میں برہان نظم ایک خاص طریقہ سے مشرکین سے خطاب کی صورت میں استعمال ہوا ہے۔[35]

قرآن مجید، اس گروہ کے ساتھ احسن جدل سے پیش آتا ہے، جو خالق کی وحدانیت اور مخلوقات میں اصل تدبیر کے قائل ہیں، لیکن اس کے مدبر و ناظم کو ارباب اور شفیع جانتے ہیں جو خدا اور بندوں کے درمیان واسطہ ہیں۔[36]

آفرینش ہمہ تنبیہ خداوند دل است دل ندارد کہ ندارد بہ خداوند اقرار

این ہمہ نئش عجب بر درودیوار وجود ہر کہ فکرت نکند نقش بود بر دیوار[37]

آخر پر ہم ان آیات اور روایات کے چند نمونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں خداوند متعال اور عالم ہستی کے ناظم کی آیات ونشانیوں کو بیان کیا گیا:[38]

ومن آیاته خلق السماوات والارض و... یا وَمِنۡ اٰیٰتِهٖۤ اَنۡ یُّرۡسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ... یا اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ﴿۱۷﴾...

امیرالمومنین علی علیہ السالم کے کلام میں بھی مخلوقات الٰہی کے تعجب آور نظم کے بارے میں اشارے ہوئے ہیں کہ نہج البلاغہ کے مطالعہ کر کے اس چشمہ زلال سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔[39]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے کلام میں کائنات کے نظم و ہم آہنگی کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: فلما راینا الخلق منتظماً والفلك جارياً واختلاف الليل والنهار والشمس والقمر دل صحه الامر والتدبير وس ائتلاف الامر على ان المدبر واحد[40] کہ عالم خلقت کا منظم ہونا اور شب وروز کا یکے بعد دیگرے واقع ہونا، سورج اور چاند کی منظم حرکت، وغیرہ اس موضوع کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں کہ کائنات کا ناظم و مدبر ایک ہے۔ اس کے علاوہ جب ہشام بن حکم نے

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے خدا کی وحدانیت کے بارے میں سوال کیا تو حضرت نے فرمایا: اتصال التدبیر و تمام الصنع [41] نظام ہستی کی ہم آہنگی اور نظام کی پائداری و خلقت کی سالمیت، اس کی وحدانیت کی دلیل ہے۔

حواشی

[1]۔ ملاحظہ ہو: مطہری، مرتضی، توحید،ص ٣١ و ٥٨، روش رئالیسم، ج ٥ ص ٤٣، مصباح، محمد تقی، آموزش فلسفہ، ج ٢، ص ٣٦٧۔٣٦٥۔

[2]۔ جوادی آملی، عبداللہ، تبیین براہین اثبات خدا، ص ٢٣۔٢٢۔

[3]۔ ایضا،ص ٢٣۔٢٢۔

[4]۔ مصباح یزدی، آموزش فلسفہ، ج ٢ ص ٣٦٦، الہیات، سبحانی، جعفر، ص ٥٦ و ٥٧، جوادی ملی، عبداللہ، تبیین براہین اثبات خدا، ص ٣٢ و ٢٣١۔

[5]۔ مجموعہ ی آثار شہید مطہری، ج ٨، درس ہای الہیات شفا، ص ٤٥٤، روش رئالیسم، ج ٥ ص ٤٠۔

[6]۔ سورہ نمل، ٨٨۔

[7]۔ ملاحظہ ہو: مجموعہ ی آثار، ج ٨، ص ٤٥٤، اسفار، ج ٧ ص ٩٤۔ ٥٦ و ٩٥ و١٠١ و١٠٦ و١٨٨، آموزش فلسفہ، ج ٢ ص ٤٢٣ و ٤٢٤، الہیات، جعفر سبحانی، ص ٢٢٧، المیزان، ج ٤ ص ٢٦٩، مفاتیح الغیب، ج ١، ص ٣٥٢۔ ٣٥٠، تبیین براہین اثبات خدا، جوادی آمل، عبداللہ، ص ٢٤۔٤١ و ٢٣٣۔

[8]۔ جوادی آملی، عبداللہ تبیین براہین اثبات خدا، ص ٤٢۔ و ٢٢٧۔

[9]۔ ایضا، ص ٢٢۔ و ٢٣١، سبحانی، جعفر، الہیات، ص ٥٧۔٥٦۔

[10]۔ جوادی آملی، عبداللہ، تبیین براہین اثبات خدا، ص ٢٣١۔

[11]۔ ایضا، ص ٢٣٢۔

[12]۔ ایضا، ص ٣٩ و ٤٠۔

[13]۔ ایضا مرتضی مطہری، توحید، ص ٦١۔٦٠۔

[14]۔ ملاحظہ ہو: تبیین براہین اثبات خدا، ص ٣٠۔ ٢٩ و ص ٢٣٠۔ ٢٢٨۔

[15]۔ ایضا،ص ۲۹۔

[16]۔ ایضا،ص ۲۲۸۔

[17]۔تبیین براہین اثبات خدا،ص ۳۳۔

[18]۔ ایضا، ۲۳۰۔

[19]۔ ایضا،۲۲۸۔

[20]۔ ایضا،ص ۲۳۰۔

[21]۔ ایضا،ص ۳۲ ملاحظہ ہو: براہیں اثبات خدا،ص ۲۲۹۔۲۲۸۔

[22]۔ ایضا،ص ۲۳۰۔

[23]۔تبیین براہین اثبات خدا،ص ۲۲۔و ۲۲۸۔

[24]۔ ایضا،ص ۳۲۔

[25]۔ ملاحظہ ہو: مطہری، مرتضی، مجموعہ آثار، ج ۸،ص ٤٨٦۔ ٤٥٤، جوادی آملی،عبداللہ، تبیین براہین اثبات خدا، برہان نظم، سبحانی،جعفر، الہیات، ج ۱،ص ۵۹۔ ۵۵ و...۔

[26]۔تبیین براہین اثبات خدا،ص ۳۳۔

[27]۔ ایضا،ص ۲۳۳۔

[28]۔ ایضا،ص ۳۵ و ۲۳۳۔

[29]۔ اقسام برہان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے منطق کی کتابوں کے حصہ صناعات خمس اور سنعت برہان کی طرف رجوع کیا جائے۔

[30]۔تبیین براہین اثبات خدا،ص ۲۳۳۔

[31]۔تبیین اثبات خدا،ص ۳۷۔ ٣٦۔

[32]۔ ایضا،ص ۳۷۔

[33]۔ ایضا،ص ٤٣۔

[34]۔ ملاحظہ ہو: مصباح یزدی، محمد تقی، معارف قرآن، ج ۱۔۳،ص ۳۱۷۔ ۲۲۵، مطہری، مرتضی، روش رئالسیم، ج ۵،ص ٤٨۔ ۳۹ و توحید،ص ۱۵۳۔ ٤٤، صدر، رضا، نشانہ ہای از او، نجفی خردمند،

احمد، ہستی بخش جہان و....۔

[35]۔وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ (لقمان، ٢٥)

[36]۔تبیین براہین اثبات خدا،ص ٢٣٨۔

[37]۔سعدی۔

[38]۔ سورہ روم۔ ٢٥۔ ٢٢۔و ٤٦،لقمان،٣١،سوہ فصلت ٣٧،سورہ شوری ٢٩،سورہ غاشیہ،٢١۔١٧و...۔

[39]۔نہج البلاغہ،صبحی صالح،خطبہ ہای:١،٨٣،٩١،١٥٥،١٦٥،١٨٢،١٨٥،١٨٦،٢١١ ...۔

[40]۔صدوق،توحید،ص ٢٤٤۔

[41]۔صدوق،توحید،ص ٢٥٠۔

کن حالات میں دعا قطعی طور پر قبول ہوتی ہے؟

مختصر جواب

لفظ دعا مانگنے، طلب حاجت اور مدد مانگنے کے معنی میں ہے اور کبھی اس کے معنی مطلق مانگنے کے لئے مراد ہوتے ہیں ۔ اصطلاح میں دعا، خدا سے حاجت طلب کرنا ہے۔ لفظ دعا اور اس کے مشتقات قرآن مجید میں تقریباً ۱۳ معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

چونکہ دعا بھی ایک عبادت ہے، اس لئے دوسری عبادتوں کے مانند اس کے بھی کچھ منفی ومثبت شرائط ہیں، جن کی رعایت کرنے سے تقرب حاصل ہوتا ہے اور دعا مستجاب ہوتی ہے۔استجاب دعا کے معنی یہ ہیں کہ دعا فوراً قبول ہوکر اس کے آثار ظاہر ہو جائیں۔ لہٰذا کبھی اجابت کا اثر چالیس سال کے بعد ظاہر ہوتا ہے یا یہ کہ خداوند متعال اس دعا کا بدلہ آخرت میں کئی گنا عطا کرتا ہے اور اس طرح کہ دعا کرنے والا اس کا مشاہدہ کر کے آرزو کرتا ہے کہ اے کاش میری کوئی دعا دنیا میں مستجاب نہ ہوئی ہوتی!

اسلامی دانشوروں اور علما نے قرآن مجید اور معصومین علیہم السلام کی روایتوں سے استفادہ کر کے دعا کے لئے کچھ آداب وشرائط بیان کئے ہیں کہ اگر ان کی رعایت کی جائے تو دعا قطعاً مستجاب ہوگی ۔ ان شرائط کے بارے میں مرحوم فیض کاشانی نے ذکر کیا ہے کہ، اس کے دس شرائط ہیں اور کتاب عدہ الداعی سے بھی مزید دس شرائط نقل کئے ہیں ۔ کتاب دعا و تہلیلات قرآن کے مصنف نے سترہ شرائط ذکر کئے ہیں۔

مختلف روایتوں میں استعمال شدہ تعبیرات کے پیش نظر، دعا کے قطعی طور پر مستجاب ہونے میں موثر شرائط کا نام لیا جا سکتا ہے، جیسے:

دعا، کائنات کے احسن نظام اور قطعی قضائے الٰہی کے خلاف نہیں ہونی چاہئے ورنہ قبول نہیں ہوتی ہے۔ دعا کی ابتدا اور انتہا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنا چاہئے۔ دعا کرنے والے کو خداوند متعال کی تئیں مکمل قلبی معرفت و شناخت رکھنا چاہئے۔ دعا کرنے والے کی امید صرف خدا وند متعال پر ہونی چاہئے اور اس کے علاوہ کسی پر بھروسا نہیں کرنا چاہئے، دعا، اخلاص و اضطرار کی حالت میں ہو، اس کی زبان اور دل آپس میں ہم آہنگ ہوں، واجبات بجالاکر اور محرمات کو ترک کر کے اپنے گناہوں کے بارے میں استغفار کرے، دعا کو دہرائے اور اصرار کرے اور یقین کے ساتھ خداوند متعال سے مانگے اور مایوس نہ ہو جائے اور کہے: خداوندا! جس طرح تو مصلحت سمجھتا ہے اور میرے حق میں بہتر ہو وہی میرے لئے قبول فرما۔ اگر ان حالات میں دعا مانگی جائے تو یقین رکھنا چاہئے کہ خدا وند متعال ضرور اس دعا کو مستجاب فرمائے گا، اگر چہ اس کے اثرات بعد میں ہی ظاہر ہوں۔

تفصیلی جواب

سوال کی وضاحت سے پہلے، قرآن مجید کی روشنی میں دعا کے معنی اور اس کی ضرورت کے بارے میں ایک سرسری اشارہ کرنا مناسب ہے۔ دعا کی ضرورت اور اس کے انجام کا مسئلہ نہ صرف دین اسلام میں ایک قطعی و مسلم امر ہے، بلکہ گزشتہ انبیا کے ادیان میں بھی دعا کا مسئلہ ایک قطعی امر تھا اور انبیا و اولیائے الٰہی نے اس مطلب کے بارے میں کہا اور سکھایا ہے، اس کے علاوہ انہوں نے خود بھی متعدد مواقع پر دعا کی ہے۔ مثال کے طور پر حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کی دعا اور اس کا قبول ہونا، جو سورہ ابراہیمؑ کی آیت نمبر ۳۷ میں درج ہے۔[1] اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام [2] اور دوسرے انبیا علیہم السلام کی دعائیں قابل ذکر ہیں۔

خداوند متعال نے قرآن مجید کی متعدد آیات میں اپنے بندوں کو دعا کرنے کی دعوت دی ہے، من جملہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۶ اور سورہ غافر کی آیت ۶۰۔ قابل غور ہیں۔

دعا کے لغوی اور اصطلاحی معنی: دعا، مانگنے، طلب حاجت اور مدد چاہنے کے معنی میں ہے اور کبھی مراد مطلق مانگنے کے معنی میں ہوتی ہے۔[3]

اصطلاح میں دعا، خدا وند متعال سے حاجت طلب کرنے کے معنی میں ہے ۔ لفظ دعا اور اس کے مختلف مشتقات، قرآن مجید میں تقریباً ۱۳ معانی میں استعمال ہوئے ہیں، من جملہ: مانگنا، دعا کرنا، خدا سے چاہنا، ندا کرنا، آواز بلند کرنا، کسی چیز کی یا کسی کی طرف دعوت کرنا، استغاثہ و مدد طلب کرنا، عبادت کرنا وغیرہ۔[4]

بعض آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا ایک صورت میں خداوند متعال کی عبادت و پرستش ہے۔ اس کے علاوہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ: الدعا مخ العبادہ اس لحاظ سے دعا بھی دوسری عبادتوں کے مانند بعض مثبت و منفی شرائط کی حامل ہوتی ہے. دوسرے الفاظ میں، دعا کو صحیح اور مکمل طور پر انجام پانے اور مورد تقرب و استجابت قرار پانے کے لئے دعا کرنے والے کے لئے کچھ شرائط اور اداب کی رعایت کرنا، رکاوٹوں اور موانع سے اجتناب کرنا ضروری ہے. اس مسئلہ پر توجہ کرنے سے ہی بعض دعاؤں کے قبول نہ ہونے کی علت معلوم ہوتی ہے، کیونکہ خداوند متعال حکیم و علیم ہے اور اس کے تمام کام حکمت و مصلحت کے مطابق ہوتے ہیں اور دعا کا قبول ہونا بھی مصلحت سے وابستہ ہے اور قبولیت کے وعدہ کے لئے بھی مصلحت شرط ہے. اگر کوئی کریم اور مہربان شخص یہ اعلان کرے کہ جو بھی مجھ سے کوئی چیز مانگے میں اسے عطا کروں گا اور کوئی شخص ایک ایسی چیز مانگے جو اس کے لئے مضر ہو بلکہ وہ چیز اس کے لئے مہلک ہو، لیکن وہ خیال کرتا ہو کہ وہ چیز اس کے لئے نفع بخش ہے، تو اس صورت میں اس کریم اور مہربان شخص کے لئے وہ چیز عطا نہ کرنا ہی مناسب تر ہے. بلکہ اسے

عطا کرنا ظلم ہے. بندوں کی اکثر خواہشات ان کے لئے نقصان اور ضرر کا سبب ہوتی ہیں جبکہ وہ خود اس سے واقف نہیں ہوتے ہیں.[5]

رفت طغیان آب از چشمش گشاد آب چشمش زرع دین را آب داد

ای بسا مخلص که نالد در دعا تا رود دود خلوصش بر سما

تا رود بالای این سقف برین بوی مجمر از انین المذنبین

پس ملایک با خدا نالند زار کای مجیب ہر دعا وی مستجار

بنده مومن تضرع می کند او نمی داند بجز تو مستند

تو عطا بیگانگان را می دہی از تو دارد آرزو ہر منتہی

حق بفرماید که نز خواری اوست عین تاخیر عطا یاری اوست[6]

حدیث قدسی میں آیا ہے: میرے بعض بندوں کی اصلاح نہیں ہوتی ہے اور وہ اپنے ایمان کی حفاظت نہیں کرتے ہیں مگر یہ کہ بے نیازی اور ثروتمندی سے، اگر ان کے لئے کوئی دوسری حالت پیدا ہوجائے تو وہ نابود ہوکر رہ جائیں گے اور بعض دوسروں کی مصلحت فقر و تنگدستی میں ہوتی ہے اور اگر ان کے لئے اس کے علاوہ کوئی چیز مقدر ہوجائے تو وہ ان کی ہلاکت کا سبب بن جائے گی[7] یہاں پر ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوجائے کہ خداوند متعال ہماری مصلحت کو بہتر جانتا ہے اور جو کچھ چاہے ہمارے حق میں مقدر فرماتا ہے اور قطعا وہی واقع ہوگا، اس لئے ضرورت ہی نہیں کہ ہم دعا کریں اور خدا سے مانگیں! اس کے جواب میں یہ کہنا کافی ہے کہ: بندہ کی بعض الہی تقدیروں کے محقق ہونے کے لئے دعا کی شرط ہے، اس معنی میں کہ اگر بندہ دعا کرے اور اللہ سے کوئی چیز مانگے، تو خدا کی مصلحت اس چیز کے واقع ہونے میں ہوتی ہے اور اگر وہ دعا نہ کرے تو خدا کی مصلحت شامل حال نہیں ہوتی ہے اور اس کے لئے وہ چیز مقدر نہیں ہوتی ہے[8].

اس لئے خداوند متعال اس دعا کو مسترد کرتا ہے اور اسے قبول نہیں کرتا ہے، جو کائنات کے احسن نظام اور قضائے قطعی کے خلاف ہو. مثلا اگر کوئی شخص خداوند متعال سے یہ مانگے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے اور کبھی نہ مرے، تو یہ دعا، سورہ آل عمران کی آیت ۱۸۵ میں ذکر کی گئی قضائے الٰہی (کل نفس ذائقہ الموت) کے منافی ہے. اور یا یہ کہ خدا سے مانگے کہ اسے اس کی مخلوق میں سے کسی کا محتاج نہ بنائے، تو یہ دعا کبھی مستجاب نہیں ہوگی. روایت میں آیا ہے کہ، حضرت علی علیہ السلام نے، یوں سنا کہ ایک شخص اپنے دوست کے لئے دعا کرتا ہے اور کہتا ہے: خداوند متعال سے دعا کرتا ہوں کہ تیرے لئے ناخوشگوار حالات اور مکروہات پیش نہ آئیں. علی علیہ السلام نے فرمایا: تم نے خداوند متعال سے اپنے دوست کے لئے موت مانگی ہے![9] یعنی حقیقت میں جب تک انسان زندہ ہے، فطرت اور عالم خلقت کے نظام کے تحت ناخوشگوار حالات اور بلاؤں کا خطرہ اس پر لاحق ہوتا ہے، مگر یہ کہ دنیا میں نہ ہو.

دعا قبول نہ ہونے کے سلسلہ میں، علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت کی توجیہ وتفسیر میں شرائط کے عنوان سے: چند وجوہات بیان کی ہیں:

پہلی وجہ: دعا کو قبول کرنے کے سلسلہ میں وعدہ الٰہی کے لئے مشیت اور ارادہ الٰہی کی شرط ہے، یعنی اگر وہ چاہے اور اس کی مشیت کے مطابق ہو تو اسے قبول کرتا ہے اور جیسا کہ خداوند متعال کا قول ہے کہ فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء[10] اور اگر وہ چاہے تو آپ سے رنج و بلا کو دور کرتا ہے...

دوسری وجہ: روایت میں اجابت سے مراد، اس کا لازمہ ہے اور دعا کو سننا اور اس پر عنایت کیا جانا ہے، کیونکہ خداوند متعال مومن کی دعا کو فوری طور پر قبول کرتا ہے لیکن اس کے اثر کو ظاہر کرنے میں تاخیر کرتا ہے تاکہ بندہ دعا کو جاری رکھے اور خداوند متعال اس کی محبوب آواز کو سنتا رہے.

آن یکی اللّٰہ می گفتی شبی تاکہ شیرین می شد از ذکرش لبی
گفت شیطان آخر ای بسیار گو این ہمہ اللّٰہ را لبیک گو
گفت لبیکم نمی آید جواب زآن ہمی ترسم کہ باشم رد باب
گفت آن اللّٰہ تو لبیک ماست و آن نیاز و درد و سوزت پیک ماست
حیلہ ہا و چارہ جوییہای تو جذب ما بود و گشاد این پای تو
ترس و عشق تو کمند لطف ماست زیر ہر یارب تو لبیک ہاست [11]

تیسری وجہ: خداوند متعال نے دعا کو قبول کرنے کے لئے یہ شرط مقرر فرمائی ہے کہ مستجاب ہونے والی چیز بندہ اور دعا کرنے والے کی مصلحت اور خیر میں ہو، کیونکہ خداوند متعال حکیم ہے اور جو کچھ اس کے بندوں کی مصلحت و سعادت کا سبب ہو اس کو غیر مفید مطالبات کی وجہ سے ترک نہیں کرتا ہے، پس واضح ہوا کہ اس طرح کے وعدوں کو حکیم و دانا خدا کی طرف سے شروط و مصلحت کے مطابق جان لیں [12].

کتاب اصول کافی میں دعا کی اجابت کے لئے چار معانی بیان ہوئے ہیں جو عبارت ہیں:

۱. خداوند متعال دعا کرنے والے کی حاجت فورا پوری کرتا ہے.

۲. خداوند متعال دعا کرنے والے کی درخواست کو منظور کرتا ہے، لیکن چونکہ اس کی آواز کو سننا پسند کرتا ہے، اس لئے نتیجہ کو ظاہر کرکے تاخیر فرماتا ہے.

۳. اس کی دعا کو قبول کرکے مستجاب کرتا ہے لیکن اس کے اثر کو اس کے گناہوں کو پاک کرنے کے لئے قرار دیتا ہے.

٤. اس کی دعا کو قبول کرتا ہے، اور اسے اس کی آخرت کے لئے ذخیرہ و زاد راہ قرار دیتا ہے [13].

مذکورہ مطالب سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا قبول ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دعا فورا مستجاب ہونے کے بعد اس کے اثرات بھی فوری طور پر ظاہر ہوجائیں اور دعا کرنے والا اپنے مقصود تک پہنچ جائے، کیونکہ سورہ یونس کی آیت ۸۹ میں بیان ہوا ہے کہ خداوند متعال نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو مستجاب فرمایا، لیکن کچھ مصلحتوں کی بنا پر اس کے اثر، یعنی فرعون کی نابودی کو چالیس سال کے بعد ظاہر کیا.

اور کبھی دعا کی اجابت کا اثر یوں ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند متعال دعا کرنے والے، جو خود اپنی مصلحت کو نہیں جانتا ہے، کے مطالبہ کو کئی گنا بڑھا کر آخرت میں اسے عطا کرتا ہے اور جب وہ آخرت میں اپنے دعا کے اثر کا مشاہدہ کرتا ہے، تو آرزو کرتا ہے کہ کاش ! میری کوئی حاجت دینا میں مستجاب نہ ہوئی ہوتی ! (اس سے تصدیق ہوتی ہے کہ اس کی دعا مکمل طور پر مستجاب ہوئی ہے)[14].

یہاں تک ہم نے دعا کے معنی اس کی اہمیت اور شرائط کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ کیوں بعض دعائیں مستجاب نہیں ہوتی ہیں اور دعا کی اجابت سے مراد کیا ہے اب مذکورہ سوال یعنی کن حالات میں دعا قبول ہوتی ہے؟ کے جواب کا موقع فراہم ہوا ہے. اسلامی دانشور اور مفسرین نے قرآن مجید کی آیات اور معصومین علیہم السلام کی روایات سے استفادہ کرکے دعا اور دعا کرنے والے کے لئے بعض شرائط اور آداب بیان کئے ہیں، اگر ان کی رعایت کی جائے تو دعا موثر ہوکر مستجاب ہوگی. دعا وتہلیلات قرآن نامی کتاب میں آداب دعا کے سترہ شرائط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جیسے: خدا کی معرفت، دعا کرنے والے کے دل اور زبان کے درمیان ہم آہنگی، واجبات کو بجالانا اور محرمات کو ترک کرنا، گناہوں سے توبہ کرنا اور محمد وآل محمد صلی اللہ وعلیہ وآلہ وسلم پر درود وسلام بھیجنا وغیرہ[15]. مرحوم فیض کاشانی نے اپنی کتاب محجہ البیضا میں آداب دعا کے دس شرائط لکھے ہیں. اس کے علاوہ علامہ حلی رحمۃ اللہ کی کتاب عدہ

الدعی سے بھی دس شرائط نقل کئے ہیں. ان میں سے بعض شرائط عبارت ہیں: دعا میں ارادہ، دعا میں اجتماع، دل سے خدا کی رسائی حاصل کرنا، اپنی حاجات کے سلسلہ میں غیر خدا پر بھروسا نہ کرنا وغیرہ...[16].

قطعی طور پر استجابت دعا سے متعلق روایات کے بارے میں چند تعبیریں استعمال ہوئی ہیں جو یہاں پر قابل ذکر ہیں. امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: دعا ہمیشہ پردہ کے پیچھے ہوتی ہے، یعنی اگر دعا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود وسلام پر مشتمل نہ ہوتو[17]، بارگاہ الٰہی میں براہ راست نہیں پہنچ سکتی ہے.

ایک روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی دعا کرنا چاہے تو اسے پہلے پیغمبر اکرم صلی پر درود بھیجنا چاہئے کیونکہ پیغمبر پر دورد مقبول الٰہی ہوتا ہے اور خداوند متعال ایسا نہیں ہے کہ دعا کے ایک حصہ کو قبول کرے اور دوسرے حصہ کو مسترد کرے[18]. اور ایک دوسری روایت میں فرمایا ہے کہ: ابتدا میں درود بھیجنے کے علاوہ دعا کے اختتام پر بھی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے وآل محمد علیہم السلام پر درود بھیجنا چاہئے[19].

امام مجتبیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص اپنے دل کے بارے میں محتاط و ہوشیار ہوتا کہ خدا کو ناپسند وسوسے اور برے خیالات اس کے دل میں پیدا نہ ہوجائیں، تو میں اس شخص کی دعا قبول ہونے کی ضمانت دیتا ہوں[20].

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: غیر خدا سے امید کا رابطہ توڑ دیجئے، تا کہ آپ کا دل خدا کے علاوہ کسی طاقت پر بھروسا نہ کرے، پھر دعا کیجئے، یقیناً وہ دعا قبول ہوگی[21].

اس کے علاوہ روایت ہے کہ: جس مظلوم کا خدا کے سوا کوئی سہارا نہ ہو، اس کی دعا یقینا مستجاب ہوتی ہے[22].

اس بنا پر اگر دعا زبان پر موثر واقع ہوئی، تو سائل کو مسترد نہیں کیا جاتا ہے اور اس کی دعا قبول ہوگی. کیونکہ فاعل اور دعا کو قبول کرنے والا، تمام اور فوق تمام ہے اور اس کا فیض، کامل اور فوق کامل ہے اور اگر فیض، ظاہر نہ ہو اور اثر نہ کرے تو قابلیت میں عیب ہے. پس اگر دعا کرنے والے میں فیض کو قبول کرنے کی قابلیت موجود ہو تو اسے خداوند متعال کے فیوض کے لامتناہی خزانوں سے فیض حاصل ہوتا ہے جن میں نہ کبھی کمی واقع ہوتی ہے اور نہ یہ خزانے خالی ہوتے ہیں [23]. اس لئے کہا گیا ہے کہ امور تین قسم کے ہیں: اول یہ کہ دعا کے بغیر ان کے عطا ہونے میں مصلحت ہوتی ہے، اس صورت میں انسان دعا کرے یا نہ کرے خداوند متعال اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے. دوسرے یہ کہ دعا کے باوجود عطا ہونے میں مصلحت نہیں ہوتی ہے اس صورت میں اگر دعا بھی کی جائے تو عطا نہیں ہوتی ہے. تیسرا یہ کہ دعا کرنے کی صورت میں عطا ہونا مصحلت ہوتی ہے اور بدون دعا عطا ہونا مصلحت نہیں ہوتی ہے، اس صورت میں عطا ہونے کے لئے دعا کی شرط ہے. چونکہ انسان عام امور کی مصلحت وخلاف مصلحت کی تشخیص کرنے سے عاجز ہے، اس لئے اسے دعا کرنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے اور اگر دعا مستجاب نہیں ہوئی تو اسے مایوس نہیں ہونا چاہئے اور جاننا چاہئے کہ اس کے قبول ہونے میں مصلحت نہیں تھی ،اس کے علاوہ، جیسا کہ پہلے اشارہ ہوا کہ دعا عبادت ہے بلکہ بہترین عبادتوں میں سے ایک عبادت ہے جو پروردگار عالم کا تقرب حاصل ہونے کا سبب بنتی ہے، اور تقرب بذات خود ہر عبادت کا ثمر شمار ہوتا ہے۔[24] جب انسان دعا کے لئے اپنے ہاتھ بلند کرتا ہے، روایات اور معصومین علیہم السلام کی سنت کے مطابق مستحب ہے کہ اپنے ہاتھوں کو اپنے سر اور چہرے پر کھینچ لے، کیونکہ خداوند متعال کی مہربانی ان ہاتھوں میں عطا ہوئی ہے، جو ہاتھ بارگاہی الٰہی میں بلند ہوتا ہے وہ کبھی خالی نہیں لوٹتا اور جو ہاتھ عطائے الٰہی حاصل کر چکا ہے وہ محترم ہے لہٰذا بہتر ہے کہ اسے اپنے سر یا چہرے پر کھینچ لیا

جائے۔[25]

اے یکدلہ ی صددلہ،دل یک دلہ کن مہرد گران راز دل خودیلہ کن

یک روز بہ اخلاص بیا بر در ماگرکام تو بر نیامد آنگہ گلہ کن[26]

مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: عنوان: دعا میں مصلحت کی تشخیص کا طریقہ کار، سوال نمبر 21 ۷۔

حواشی

[1]۔فلسفی، محمد تقی،شرح دعای مکارم اخلاق، ج۱ص۲۔

[2]۔سورہ طہ، ۲۵۔۲۸۔

[3]۔قرشی، سید علی اکبر، قاموس قرآن، وازی دعای۔

[4]۔دانشنامہ ی قرآن وقرآن پژوہی بہ کوشش بہاوالدین خرمشاہی، ج۱ص۱۰۵٤۔

[5]۔سید محمد باقر شہیدی وہبہ الدین شہرستانی رحمہم اللہ، دعاوتہلیلات قرآن،ص ٤۳.

[6]۔مثنوی معنوی، دفتر ششم، ابیات ٤۲۲۲، ٤۲۱٦.

[7]۔ملاہادی سبزواری، شرح اسماالحسنی چاپ مکتب بصیرتی قم،ص۳۲

[8]۔برگرفتہ از محمد باقر شہیدی، دعاوتحلیلات قرآن ص٤۳.

[9]۔فلسفی، محمد تقی،شرح دعای مکارم الاخلاق، ج۱ص۷

[10]۔انعام٤۱

[11]۔مولوی، مثنوی معنوی، دفتر سوم، ابیات ۱۸۹۱۹۰و۱۹٤۱۹۷.

[12]۔محمد باقر مجلسی، مراہ العقول، ج۱۲ص۲۰۔۱۹، حاشیہ

[13]۔کلینی، الکافی، والروضہ، ج۱ص۳۳۰، پاورقی

[14]۔مجلسی، محمد باقر، مرآہ العقول، ج۱۲ص٥۔۱.

[15]۔شہیدی وشہرستانی، دعاوتہلیلات قرآن،ص۱٥۔

[16]۔فیض کاشانی، محجہ البیضا، ج۱ص۳۸۰۔۳۰۱۔

[17]۔کافی،ج۲،ص۴۹۱۔

[18]۔امالی شیخ طوسی،ج۱،ص۱۵۷۔

[19]۔فلسفی،محمد تقی،،شرح دعای مکارم اخلاق،ج۱،ص۹۔

[20]۔کافی،ج۲،ص۶۷،ح۱۱۔

[21]۔بحار،ج۷۲،ص۱۰۷،ح۷۔

[22]۔جوادی آملی،عبداللہ،حکمت عبادات،ص۲۲۰ الی ۲۳۴۔

[23]۔امام خمینی رحمہم اللہ،شرح دعای سحر،ترجمہ سید احمد فہری،ص۳۸۔

[24]۔محمد باقر شہیدی،رہبہ الدینشہر ستانی،دعا وتہلیلات قرآن،ص۴۵۔

[25]۔جوادی آملی،عبداللہ،حکمت عبادات،ص۲۱۵۔

[26]۔روان جاوید،ج۱،ص۲۹۶۔

دین کیوں مکمل صورت میں اور دفعتاً نہیں بھیجا گیا اور اس کے تدریجی صورت میں ارسال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

مختصر جواب

دین کا تدریجی صورت میں بھیجا جانا ایک جہت سے انسان کی فکری اور روحانی توانائیوں کے مطابق ہے اور دوسری جہت سے اس کی دنیوی اور اجتماعی ضرورتوں کے مطابق ہے۔ اس لحاظ سے چونکہ ابتدائی انسان مناسب فکری قوت نہیں رکھتا تھا اس لئے وہ مستقبل کے زمانوں میں رونما ہونے والے معارف کو ادراک نہیں کرسکتا تھا اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے والے انسان بھی آپؐ کی تعلیمات کے لئے مناسب فکری و معنوی توانائی نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی انسان خاندان کی صورت میں زندگی بسر کرتے تھے اور اجتماعی زندگی اور اس کے روابط کی ضرورت کا احساس نہیں کرتے تھے، اس لئے ان میں فہم کی توانائی اور اجتماعی تعالیم اور احکام حاصل کرنے کا تصور ہی نہیں تھا۔ اسلام سے پہلے محدود اجتماعی زندگی بسر کرنے والے انسان، ان وسیع تعلیمات کی صورت کا احساس نہیں کرتے تھے۔ اس لئے ان کی فکر اور توانائیوں سے زیادہ تربیت و تعلیمات اور غیر ضروری

احکام ایک لغو بات تھی، بلکہ ان چیزوں کا تعلیم و تفہیم ان کے لئے تکلیف مالا یطاق (طاقت سے زیادہ ذمہ داری) تھی۔ لیکن معاشروں کی ضروری ترقی اور انسان کی فکری و روحی بلندی کے بعد بعض ایسے قوانین و معارف اس کے اختیار میں دیئے گئے کہ قیامت تک ان پر عمل کر کے انسان اپنی ترقی و سربلندی کے دنیوی و اخروی مدارج کو طے کرسکتا ہے۔

تفصیلی جواب

دین کی تشریع اور انسان کی سربلندی و ترقی کی طرف ہدایت کرنے کے لئے تکالیف وضع کرنے کا مقصد انسان کو دنیوی الجھنوں سے نجات دلا کر اسے حقیقی انسانیت کی راہ میں گامزن کرنا ہے۔ ایک طرف سے انسان کی عقلی اور روحانی توانائی اور دوسری طرف سے اس کی ضرورتیں، رشد و تکامل کی حالت میں ہیں اور وہ ابتدا سے ہی آخری تعلیمات کو حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ خداوند متعال کی اطلاع آگاہی کے طریقہ کار کی نسبت انسان کی مثال اس بچے کی جیسی ہے جسے ابتدائی مراحل میں صرف بعض مفاہیم، اس کے بعد بعض حروف و اعداد سکھائے جاتے ہیں تاکہ تعلیم و تربیت کے لئے آمادہ ہو جائے اور علمی مراحل کو تفصیل اور لوازمات کے ساتھ یکے بعد دیگرے کامیابی کے ساتھ طے کرے اور اس جگہ پر پہنچ جائے جہاں اسے فارغ التحصیل اور محقق کہا جائے۔ اس کے بعد دوسرے اس کی تلاش اور کوششوں کے ماحصل سے استفادہ کر کے بہرمند ہوتے ہیں۔ جس طرح پہلی جماعت میں بچے کو یونیورسٹی کی تعلیم نہیں دی جاتی ہے۔ اسی طرح انسان ابتدائی مراحل میں مستقبل میں آنے والے انبیا کی تعلیمات اور احکام کو حاصل نہیں کرسکتا تھا اور نہ اسے اس کی ضرورت تھی کیونکہ گزشتہ امتیں، خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو حاصل کرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتی تھیں۔

مذکورہ مطالب کے علاوہ، انبیا کی عمر اور ان کی روحانی اور فکری قوتوں کی محدودیت

بھی دین کی تدریجی تکمیل کا ایک سبب تھا۔ اگر چہ یہ امر مسلم ہے کہ ہر نبی، اپنے ہم عصر لوگوں کی نسبت ہر جہت سے افضل، اکمل و اعلم ہوتا تھا۔ اس لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: خداوند متعال نے کسی پیغمبر کو مبعوث نہیں کیا ہے، مگر یہ کہ اس نے اپنی عقل کو کمال تک پہنچایا ہو اور اس کی (روحانی وعقلی) توانائیاں اس کی پوری امت کے بہ نسبت افضل و برتر ہو۔[1]

اس کے علاوہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا: خداوند متعال نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب وروح کو بہترین اور لطیف ترین قلوب میں سے پایا، لہٰذا انہیں پیغمبری کے لئے منتخب کیا۔[2] چونکہ انسان کی عقل وفہم اور وسعت قلب کی گہری شناخت ایک باطنی امر ہے، یہ خداوند متعال ہے کہ جو جانتا ہے کہ اس کی رسالت کہاں (اور کس شخص میں) قرار دے۔[3] اور چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حتی امامؑ کو انتخاب ونصب کرنے کی طاقت انسان میں مفقود ہے۔ اس لئے تعلیم کی مقدار اور اس کی کیفیت اور شریعتوں کی تجدید اور گزشتہ شریعتوں کی تنسیخ، سب خداوند متعال کی حکمت، علم اور اذن سے مربوط ہے اور اس کا فیصلہ اور معین کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔

دوسری جانب گزشتہ امتوں میں تبلیغ اور آگاہی کی محدودیت اس امر میں ایک رکاوٹ تھی کہ تمام زمانوں کے لئے صرف ایک ہی دین باقی رہے اور یہی دین تمام لوگوں تک پہنچ جائے۔ خاص کر جب یہ محدودیت ایک طرف حفظ، درج اور آگاہی اور دوسری طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے لحاظ سے بعید ہونے، کی وجہ سے اقوام کے بزرگوں کے توسط سے تعلیمات اور احکام الٰہی میں نسیان پیدا کرنے کا سبب بن جاتا اور اس شریعت کے ذریعہ ہدایت کا مقصد نابود ہو کے رہ جاتا۔ لیکن اسلام کے بعد، خاص کر اس دین کے اسلاف کی میراث کو کتابت کی تاکید وتحفظ اور تجارت کی وسعت اور ثقافتی لین دین کو ترویج بخشنے کے سبب یہ مشکل حل ہوگئی۔ یہ سب عوامل ایک طرف اور بعض احکام وشریعتوں کا عارضی اور

عبوری ہونا دوسری طرف سے، مثلاً یہودیوں کے لئے بعض پابندیاں تنبیہ اور سزا کا پہلو رکھتی تھیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت کے نتیجہ میں وہ پابندیاں اٹھالی گئیں۔[4]

دین اسلام بھی اس امر سے مستثنیٰ نہیں تھا، اس لئے یہ دین بھی ۲۳ سال کی مدت کے دوران تدریجاً تکمیل تک پہنچا ہے اور اس دوران، بعض احکام جیسے شراب، جوا اور زنا وغیرہ کی حد کے احکام تدریجاً بیان ہوئے اور حج تمتع کے الٰہی مناسک کی، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری حج، یعنی ہجرت کے دسویں سال (بعثت کے ۲۳ ویں سال) تربیت دی گئی اور اس پر عمل کیا گیا، اور بعض دوسرے احکام جیسے نجوی کی حالت میں صدقہ دینا منسوخ کئے گئے۔[5] کیونکہ یہ امر کسی حکیم اور سیاست دان سے مخفی نہیں ہے کہ ایک قوم کے افکار، حالات اور رفتار، ایک رات میں وجود میں نہیں آتے ہیں، بلکہ ایک قوم کی عمران حالات سے وابستہ رہتی ہے جو اسلاف سے سینہ بہ سینہ اور نسل بہ نسل منتقل ہوتے ہیں، ان کو دفعتاً بدلا نہیں جاسکتا ہے خاص کر اگر ان پر جاہلانہ تعصب کی روح حاکم ہو۔

بے شک، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ان تمام احکام کو شب قدر یا شب معراج میں دفعتاً وصول کرنے کی طاقت موجود تھی، لیکن دوسروں میں یہ طاقت موجود نہیں تھی تا کہ دفعتاً بدل جائیں اور ایک ہی جگہ پر ان تمام احکام کی تربیت حاصل کر کے ان پر عمل کریں۔

چنانچہ امام علی علیہ السلام کو بھی بدعتوں کو دور کرنے میں ان ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور یہی مشکلات آپ کے لئے امت کی اصلاح کرنے کی فرصت اور قوت سلب کرنے کا سبب بنے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام تک آپؐ بھی ان مشکلات سے دوچار تھے اور اگرچہ قرآن مجید مکمل ہو چکا تھا، لیکن اس کی تفسیر کا بیان لوگوں کے فہم و ادراک کے مناسب نہیں تھا۔

اس لئے اسلام کی خالص تعلیمات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باوسعت سینے میں

امانت کے طور پر قرار پائیں تا کہ آپؐ لوگوں کے مرشد اور احکام و معارف کو بیان کرنے والے بن جائیں اور یہ امر آپؐ سے دوسرے تمام ائمہ اطہار علیہم السلام میں منتقل ہوا۔ ائمہ اطہار علیہم السلام نے زبردست کوششیں کیں کہ ایسے شاگردوں اور امت کی پرورش کریں جو کتاب وسنت کی طرف رجوع کر کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی روش اور تعلیمات کے سلسلہ میں امام عصر (عج) کے ظہور تک تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنی راہ کو پاسکیں۔ خاص کر جبکہ وحی کا اصلی منبع، یعنی قرآن مجید اب تک ہر قسم کی تحریف اور تبدیلی سے محفوظ رہا ہے اور جو جعلی اور صحیح احادیث میں فرق کرنے کا معیار بھی ہے۔

علمائے شیعہ کی علمی سیرت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ دین، دین کامل ہے اور قیامت تک انسان کی دنیوی و معنوی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے۔ اگر دشمن رکاوٹ نہ بنیں تو تمام دنیا میں قسط، عدل وانصاف اور صلح وصفا کا ماحول بر پا کیا جاسکتا ہے۔ اگر چہ وعدہ الٰہی کے مطابق یہ دشمنان رکاوٹیں ڈالنے سے دستبردار نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ مصلح موعود (عج) کے با اقتدار ہاتھوں سے ان کو راہ سے ہٹا دیا جائے گا اور تمام دنیا میں عدل وانصاف کا بول بالا ہوگا۔

حواشی

[1]۔شیروانی،علی، درسنامہ ی عقاید،ص ۱۲۸،منقول از اصول کافی۔

[2]۔ایضاً،نقل از بحارالانوار، ج۱۸،ص ۲۰۵ ، ح ۳۶۔

[3]۔سورہ شوری،۷۔

[4]۔سورہ آل عمران،۵۰،سورہ نسا،۱۶۰۔۱۶۱۔

[5]۔سورہ مجادلہ،۱۲ و ۱۳،سورہ نور،۳،سورہ بقرہ،۱۴۳۔۱۵۰۔